بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا

اللہ وہ ہے جس نے زمین اور اسکی ہر پیداوار کو تم سب کی مشترکہ میراث ٹھہرایا ہے۔
(بقرہ۔29)

قرآن کا معاشی نظریہ

رحمت اللہ طارق

معیشت اسلامیہ کی ایسی جزئیات کی تفاصیل جو مستقبل میں نشان راہ کا کام دے سکتی ہیں

سر سیدؒ میموریل لائبریری باغبانپورہ لاہور

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

کتاب: اسلام کا معاشی نظریہ

مصنف: رحمت اللہ طارق

اشاعت: طبع اول فروری 2002ء

ناشر: سر سید ؒ میموریل لائبریری
کالج اسٹاپ جی ٹی روڈ باغبانپورہ لاہور

مطبع نیر اسد پرنٹرز لاہور

قیمت مجلد -/75 روپے۔ پیپر بیک -/60 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معیشت اسلامیہ کی ایسی جزیات کی تفاصیل
جو مستقبل میں نشان راہ کا کام دے سکتی ہیں

محمدؐ رسول اللہ
کے نام

جو ہادی برحق' سالار امم اور محسن انسانیت تھے۔

○ جنہوں نے بھوک' ننگ' افلاس اور غربت کے خاتمہ کے لئے دکھی انسانیت کو یقین دلایا— کہ — زمین اور اس کی پیداوار تمام بنی نوع بشر کی مشترکہ میراث ہے۔ (مفہوم بقرہ' 29)

اس پر اجارہ داری خلاف آداب انسانی ہے۔

○ جنہوں نے مذہبی' سیاسی اور معیشی جاگیرداری کو حرف غلط کی طرح مٹاتے ہوئے کراہتی انسانیت کو — آزاد فضا میں سانس لینے کا ڈھنگ سکھلایا اور یقین دلایا کہ روزی کی ناہموار تقسیم اللہ کی طرف سے نہیں بلادست انسانوں اور مذہبی قیادتوں کی ملی بھگت کا شاخسانہ ہے وہ تو فرماتا ہے کہ —

ہم نے تمہیں زمین پر بسایا اور اس پر سبھی کا سامان معیشت بنایا۔

(اعراف' 10)

○ جنہوں نے ڈھیر خداؤں کی عبودیت سے نجات دلا کر خدائے واحد کی حکمرانی تسلیم کرنے کا فطری درس دیا۔

○ جنہوں نے گورے اور کالے کی برتری اور کہتری کا امتیاز مٹا کر انسانیت کی بنیاد مساوی جنسیت کو قرار دیا اور

○ جنہوں نے مذہبی فیشنلٹی کو معیار نجابت و نجات نہ ٹھہرا کر مذاہبؐ مسالک کے ایوانوں میں تہلکہ مچا دیا۔

صلی اللہ علیہ وسلم

فہرست

(1) انتساب	5
(2) پس منظر	7
(3) زکوٰۃ کا رائج نظام فرسودہ اور نظر ثانی کا محتاج ہے	11
(4) صلہ کا معیار محنت یا سرمایہ	35
(5) لینن سے پہلے ابن حزم	49
(6) اسلام میں اجتماعیت کا تصور	73
(7) انبیائے کرام سماجی ہمسری کا درس دیتے تھے	99
مگر زردار ــــــــــ نہیں مانتے تھے	99
(8) جاگیرداری سماج کو پہلا رگڑا	115
(9) قرآنی انصاف کی تلاش	125
(10) قرآن کا معاشی نظام بحال کرو	139

پس منظر

1955ء کی بات ہے راقم الحروف مشرق وسطیٰ کی سیاحت اور طلب علم کے سلسلے میں رخت سفر باندھ کر پہلے عراق پہنچا پھر ہمسایہ عرب ممالک میں مکۃ المکرمۃ میں مجھے کافی سکون ملا۔ ان دنوں شام و مصر کا ادغام ہو چکا تھا بلکہ اس سے دو چار برس پہلے مصر کے شاہ فاروق کا تختہ الٹا جا چکا تھا اخوان المسلمین اور ناصر کی چپقلش شروع ہو چکی تھی جو نہایت نازک اور اذیت ناک صورت حال پر ختم ہو گئی۔ یمن، عراق اور لیبیا بھی انقلاب کی راہ تک رہے تھے وجہ ظاہر ہے کہ ہر طرف ملوک و سلاطین کا دیس تھا عامہ الناس کو نت نئے نعرے اچھے لگ رہے تھے۔ اخوان المسلمین کا —— دیننا اسلامنا —— اور —— دستورنا قرآننا —— کا سلوگن مجھے اچھا لگ رہا تھا خاص کر —— دستورنا قرآننا میں میرے لئے کشش کا پورا سامان تھا۔ مرشد العام امام المصطفیٰ السباعی کی اشتراکیۃ الاسلامیۃ میرے لئے قرآنی حوالہ سے ایک اتھینٹک دستاویز تھی میں 18 دن تک ان کی مجالس اور میٹنگوں میں حاضری دیتا رہا میں نے اپنے خاندانی پس منظر کے حسب حال پا کر دل و جان سے اشتراکیت کو قبول کر لیا کیونکہ عرب اس معاشی اصطلاح کے استعمال میں نہ قباحت محسوس کرتے تھے نہ عقیدے کے فساد کو بلکہ یوں سمجھتے تھے کہ اسلام میں زر شکنی اور ملکیت کی تحدید کا اصول پہلے ہی سے موجود ہے لہذا وہ پہلے سے ایک مانوس چیز کو کسی نئے نام سے موسوم اور قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے تھے ادھر معاہدہ تاشقند کے بعد ایوب خان نے سیاست پر نہ صرف پابندی سخت کر دی تھی طلباء کی ڈگریاں تک ضبط کر ڈالنے کا اعلان بھی کر دیا تھا جس سے لاکھوں طلبہ جو گریجوایشن کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے پڑھے لکھے بن چکے تھے وہ ایک ہی ہلے میں جاہل بنا دیئے گئے جس سے طلباء میں خوں ریز اشتعال پھیل گیا۔

اور پھر ان ہی دنوں ایوب خاں نے اعلان تاشقند پر دستخط نہ کرنے والے اپنے ایک زیرک اور نوجوان وزیر کو نہ صرف کابینہ سے الگ کر دیا بلکہ طلبا کو چانس بھی دے دیا کہ وہ رد عمل کے طور پر اس کے گرد جمع ہو کر تحریک چلائیں۔ چنانچہ ان ہی دنوں جاگیرداروں اور بڑی املاک والوں جو ایوب کے گرد جمع تھے کے خلاف نفرت کا لاوا ابل پڑا اور سوشلزم ان کا محبوب نعرہ بن گیا۔ جماعت اسلامی جو کہ شروع ہی سے امریکی نظام راسمالیت کی نقیب بنی ہوئی تھی سرمایہ داروں کی حمایت میں نکل آئی حالانکہ خیال یہ تھا کہ یہ لوگ امام حسن البناء ( ) کا احترام کرتے اور ان کے معاشی افکار سے متاثر ہوں گے اسی اثناء میں نتائج سے بے خبر ہو کر 26 فروری 1968 کے ہفت روزہ چٹان میں راقم الحروف نے ــــ **اسلامی سوشلزم** ــــ ماخذ اور استدلال کے عنوان سے ایک تجزیاتی مقالہ لکھا۔ مضمون کا چھپنا تھا کہ ہر طرف سے خیر مقدمی خطوط آنے لگے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ لوگ اس موضوع پر لٹریچر کی کمی محسوس کر رہے ہیں ادھر جنوری 1968 میں مولانا مودودی کی "ملکیت زمین" کا مدلل جواب لکھ کر مکتبہ البیان لاہور کے سپرد کر دیا تھا۔ جو چند ہی ہفتوں کے بعد "زمینداری، جاگیرداری اور اسلام" کے عنوان سے چھپ کر مارکیٹ میں آگیا۔ اسے پشاور سے لے کر کراچی تک ایک زبردست علمی دستاویز کی حیثیت سے پڑھا گیا۔ جس سے نیز معلوم ہوتا تھا کہ لوگ نئے نظام معیشت کو چاہتے ہیں ادھر یہ کچھ ہو رہا تھا ادھر چٹان کے مقالے پر ون یونٹ کے سربراہ اعلیٰ امیر محمد خان نے ملتان کی بجائے خانیوال کے ڈی ایس پی کو میرا نگران بھی مقرر کیا اور میرے کوائف لاہور بھیجنے کا معاملہ سپرد بھی کیا۔ اے بی اعوان صاحب میرے پاس تشریف لائے میں دکان میں بنیان پہنے کام کر رہا تھا تعارف کے بعد انہوں نے مدعا بیان کیا میں نے ایک عام آدمی کی طرح انہیں پروٹوکول نہیں دیا اور الٹا سیدھا بیان لکھوا دیا وہ صاحب چلے گئے اور بازار ہی کے ایک شناسا سے کہہ گئے کہ عجیب آدمی ہے مجھے نہ صرف پروٹوکول نہیں دیا پذیرائی بھی نہیں کی اسے جواب ملا کہ 40ء کے 19 مارچ کو خاکساروں پر گولی چلانے کے باعث اس کے دل میں پولیس سے نفرت ہے۔

ادھر ان ہی دنوں P-P-P کی تاسیس عمل میں آگئی اور ہر تحریر کو باب خیبر سے لے کر منوڑہ تک پڑھا جانے لگا ہائی اسکول اور کالج کے طلبا' جوں ہی میری تحریر کا سراغ ملتا' سائیکلوں پر نیوز شالوں پر پہنچ کر حاصل کر لیتے جس سے جماعت اسلامی زیادہ اشتعال میں آئی اور نہ صرف برہنہ زبان استعمال کر کے اپنے کارکنوں کو ہیجانی اور ہذیانی کیفیت میں تیار کرتی رہی سوشلزم کے بارے میں ایسی ایسی غیر علمی تشریحات کو سامنے بھی لے آئی جنہیں پڑھ کر ان کے علمی معیار پر ماتم کرنے کو جی چاہتا تھا نہ صرف یہ کہ مذہبی مجاوروں نے فکر مودودی کی پیروی کی خود فکر قرآنی والے بھی ان کے اتباع میں جت گئے —— فرض کرو کہ اشتراکیت کے پس منظر میں "دہریت" جھانک رہی تھی تب بھی افکار و اصطلاحات کا یہ بنیادی اصول ہے کہ جب بھی کوئی قوم یا اس کے دانش ور کسی اجنبی اصطلاح کو قبول کرتی ہے تو اپنے ماحول اور مذہبی و ثقافتی مزاج میں ڈھال کر کرتی ہے جمال الدین افغانی (1895م) نے اپنی موت سے ایک سال پہلے 1894م میں اسلامی سوشلزم کی اصطلاح مغربی سوشلزم کے مقابل میں وضع کی تھی ان ہی دنوں شبلی نعمانی نے **الفاروق** میں اس پر روشنی ڈالی اور اسلامی افکار میں شامل کر لیا۔ اس طرح ایک سو سال سے زیادہ عرصہ یہ اصطلاح ہمارے لٹریچر کی زینت بنی رہی۔ اسے کسی نے بھی —— گالی —— یا کفر کے بطور ذکر نہیں کیا —— پھر کیا افتاد پڑ گئی کہ خداوندان اچھرہ جس کے اکثر اراکین جو امریکی درس گاہوں کے فارغ التحصیل ہیں ان پر یہ منکشف ہوا کہ یہ تو کفر ہے ملکیتیں اور محدود ہو گئیں تو اسلام کا کیا بنے گا پھر اس ضمن میں انھوں نے یہ نہ سوچا کہ ہماری برہنہ زبان کی زد دیگر کلمہ گو مسلمانوں پر تو پڑے گی سو پڑے گی جن کو وہ فکری پیشوا تسلیم کر چکے تھے — **امام حسن البناء — امام عبدالقادر عودہ — محمد الغزالی — سید قطب شہید — امام مصطفیٰ السباعی — عبدالمتعال صعیدی** وغیرہ ان پر بھی تو زد پڑے گی۔

ناظرین محترم —— سمع خراشی طویل ہو گئی میرے یہ مقالے ان ہی دنوں کی یادگار ہیں اور آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔ آپ اچھے منصف ہیں اور مجھے بتلائیں کہ

ان میں میں نے کون سا کفر تولا اور کیا جھوٹ بولا ہے؟ کیا قرآن پاک جس نظام سے بھی عامہ الناس کو ریلیف ملتی ہے انصاف ملتا ہے صحت و تعلیم روزگار اور سر چھپانے کی جگہ میسر آتی ہے اس کی نفی کرتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ اسے اپنی ہی پالیسی کا حصہ قرار دیتا ہے — یہی وجہ ہے کہ کوثر نیازی کہتے تھے کہ آپ کے مقالے سوشلزم کی کھلی حمایت تو کجا اسلامی متبادل پیش کرنے کی وجہ سے الٹا سد راہ بن سکتے ہیں۔

والسلام مع الکرام

نیاز مند

رحمت اللہ طارق

زکوٰۃ کا رائج نظام فرسودہ اور نظر ثانی کا محتاج ہے

رحمت اللہ طارق

زکوٰۃ اسلامی معیشت کی جامع اصطلاح ہے اس کی تعبیر و تشریح میں فکری گھوڑے دوڑانا— مناسب نہ ہوگا تاہم مختلف مناسبتوں کے تناظر میں اس کی لغوی وضاحتوں سے صرف نظر بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ زکوٰۃ کے بنیادی معنی نشوونما دینے کے بھی ہیں۔ یہ نشوونما جسم دار چیزوں کے لئے ہو— مثلاً قطرہ منی اپنے فطری اصولوں کے مطابق نشوونما پاکر شکم مادر میں بچہ بن جاتا ہے— پھر اس تنگنائے سے نکل کر عالم محسوسات میں قدم رکھتا ہے۔ پھر اسی طرح نشوونما کے تمام مراحل طے کر کے حد کمال میں در آتا ہے— اسی طرح پودا بھی جسم دار وجود رکھتا ہے کہ وہاں بھی دانہ مٹی میں مل کر نشوونما پاتا— پھر اس کے پردوں کو چیر کر دنیائے رنگ و بو میں شامل ہونے کے لئے سر ابھارتا ہے— یہ زکوٰۃ کی محسوساتی نشوونما ہے— دوسری نشوونما ادراکی ہے یعنی محسوس وجود نہیں رکھتی مگر اس کا تعلق بھی تربیت سے ہے یعنی اخلاقی نشوونما جس میں اعلیٰ قدروں کو اپنانے کی "خو" بنانی پڑتی ہے۔

زکوٰۃ کا لفظ جب معیشت کی مخصوص اصطلاح کے طور پر استعمال ہوگا تو اس کے لئے اسلام کے مالی نظام کے تناظر میں تعبیری جامہ تراشنا پڑے گا جسے سنت کی قینچی چلا کر تراشا جائے گا جب کہ سنت کو قرآن کا ردیف بنایا ہی نہیں جا سکتا— بلاشبہ سنت کا اللہ کے افعال اور اقوال پر اطلاق ہوا ہے یعنی ہم صنۃ اللہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن سنت رسول ؐ نہیں کہہ سکتے— رسول ؐ کے اعمال کا تذکرہ "اسوہ" کے پیکر میں ہوگا اور یہ اسوہ قرآن کے اشاروں اور رسول ؐ کے ان اعمال کو جانچنے کا معیار ہے جو تواتر عملی (Amali) کے ذریعہ معلوم ہو سکتے ہوں۔ اس طرح تواتر عملی ہی کو

حقیقت معلوم کرنے کا موثر آلہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ تواتر علمی (Ilmi) کو بنیاد ہی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تواتر علمی (Ilmi) کا نہ وجود ہے نہ ثبوت—— اس وضاحت کے بعد آیئے" زکوٰۃ " کا اصطلاحی زاویہ سے تجزیہ کریں جس سے واضح ہو گا کہ زکوٰۃ کا رائج نظام ہی دراصل فرسودہ اور نظرثانی کا محتاج ہے۔ کیونکہ اس کے لئے فقہاء نے اپنی طرف سے نصاب کی جو حدیں مقرر کی ہیں وہ نہایت درجہ اَن سائنٹیفک اور غیر معقول ہیں یعنی ساڑھے سات تولے سونا اور ساڑھے باون تولے چاندی کسی کے پاس ہو تو اس پر اڑھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہے۔ جب کہ وحی قرآن ان باتوں کا سرے سے اشارہ ہی نہیں دیتی وہ قانون انفاق ہو خواہ قانون زکوٰۃ دونوں کو ضابطہ "العفو" سے مربوط کرتی اور اس کی روشنی میں کمی بیشی کا اشارہ دیتی ہے۔

زکوٰۃ——اسلام کا مالیاتی نظام ہے۔

ہمارے فقہا نے انگریزی دور میں "تولوں" کی شکل میں "اوزان" کا تعین کرکے کسی حد تک اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کی کوشش کی ہے ورنہ تو قدیم زمانے میں دراہم' دنانیر' واتی' مثقال' اور "اقیہ" کے ناموں سے رائج "بٹوں" سے وزن کا کام لیا جاتا تھا جب کہ یہ اوزان ملکوں اور مقامی عادات کے مطابق ہی ڈھالے جاتے اور بین الملی تقاضوں سے بے نیاز ہو کر استعمال میں لائے جاتے تھے—— لہٰذا ان میں یکسانیت کا شائبہ بھی نہ ہوتا تھا—— یہ کھلے اختلاف کا سمبل ہوتے تھے—— خود فطرانے کے لئے جو پیمانے متعین کئے گئے ان کا اختلاف پاکستان میں بھی واضح ہے۔ یہاں حنفی' عراقی صاع اور تمام سلفی مجتہد' شامی صاع کے مطابق سوا دو کیلو اور تین کیلو کے حساب سے غلہ دیتے یا مارکیٹ کے مطابق قیمت ادا کرتے ہیں۔ حالانکہ فطرانہ اگر کوئی شرعی مسئلہ ہوتا تو اس کے لئے مدینہ منورہ کے رائج پیمانے "مُد" (Mudd) کو معیار بنانا چاہئے تھا۔ چنانچہ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ حنفی کم اور

دیگر زیادہ فطرانہ ادا کر کے یکجہتی اور ہم آہنگی کا احساس تک پیدا نہیں کر پاتے ــــ بلاشبہ فطرانہ ایک نیکی ہے اور نیکیوں کا اجراء ایک اہم سماجی ضرورت ہے، لیکن زکوٰۃ جو کہ اسلام کے مالیاتی نظام کا اہم اور بنیادی ذریعہ ہے اسے "علمی" اور سائنٹیفک بنیادوں پر مرتب کرنا ضروری تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ مدرسہ اور خانقاہ نے مل کر سرمایہ داروں کو مالی منفعت پہنچانے کے لئے ادھر توجہ نہیں فرمائی بلکہ انھیں زکوٰۃ ادا نہ کرنے کے گر تو سکھائے مگر ضابطہ العفو کی ضو میں زکوٰۃ ادا کرنے کے بنیادی فریضہ سے غافل رکھا۔ حالانکہ زکوٰۃ ایک معیشی اور اسلامی قدر ہے جس کا انکار الٰہی مصلحتوں کے انکار کے برابر ہے، جب کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ احکام بذات خود مقصود نہیں ہوتے منزل تک پہنچانے کا درمیانی ذریعہ ہوتے ہیں کیونکہ ایسے احکام تربیتی دور کے لئے دیئے جاتے ہیں اور اوپر کی سطح پر پہنچ جانے کے بعد ان کا دائرہ اثر خود بہ خود ہی "محدود" ہو جاتا ہے یعنی ایک نچلی سطح کا نادار آدمی اگر زکوٰۃ کی مد سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر خوشحال بن جاتا ہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے زکوٰۃ لینے والوں کی صف ہی میں رکھنا چاہیئے ورنہ تو زکوٰۃ کا حکم منسوخ اور معطل ہو جائے گا۔

زکوٰۃ ــــ ایک عبوری حکم ہے

اسلام ایک فلاحی مملکت کا قیام لازمی ٹھہراتا ہے جو "لینے" اور "دینے" والے کی مصنوعی تفریق اور "میرا" اور "تیرا" کے غیر فطری امتیاز سے پاک و مبرا ہو ــــ خوشحالی افراد مملکت پر یکساں سایہ فگن ہو۔ کوئی کسی کا محتاج و دست نگر نہ ہو لیکن خوشحالی اور مساوات کی اس بلند سطح پر پہنچنے سے پہلے اسلام نے عبوری دور کے کچھ احکام بھی دیئے ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اسے غربت کو باقی رکھنے کے بہانے غیر محدود نہیں بنایا جا سکتا۔ خاص کر زکوٰۃ کی تقسیم خزانے کی معرفت ہو گی جس سے افراد کی خستہ حالی کا پتہ نہ چل سکے گا۔ کسی کی عزت نفس اور وقار مجروح نہ ہونے پائیں گے ــــ اس طرح پردے ہی پردے میں افراد ملت کو عبوری

امداد بہم پہنچا کر ان ذرائع اور وسائل کی تلاش اور حصول میں مدد فراہم کی جا سکتی ہے لہٰذا جو لوگ زکوٰۃ کو رسمی شکل دے کر کام چلا لیتے ہیں وہ درپردہ مستحقین کو پستی اور غربت کے گڑھوں میں دھکیل کر ان کو بنیادی اور انسانی حق سے محروم کر دینے کے مجرم ہیں۔

حکم زکوٰۃ کے مخاطب کون ہیں؟

زکوٰۃ کا حکم اگرچہ مستقل ہے مگر اس کا مخاطب ہر شخص نہیں ہے صرف صاحب حیثیت ہیں۔ مملکت، شرح زکوٰۃ جتنا مقرر کرے گی خزانے میں جمع کرانے کے مکلف ہوں گے اور خزانے والے ایسے دیانت دار ہوں کہ اس رقم کو صاحب اقتدار کے الیکشن جیتنے کے لئے خرچ کرنے کے مجاز نہ ہوں گے کہ یہ بھی ایک گونہ زکوٰۃ کے مستحقین کو محروم رکھنے کے مترادف ہو گا۔ ایسے اہل کاروں اور حکومت کو مانعین زکوٰۃ کے زمرے میں شمار کر کے ان کے خلاف جہاد کرنا ہو گا— یہ زکوٰۃ حالات کی ضو میں کم و بیش ہو سکتی ہے— مثلاً سیدنا صدیق اکبرؓ (634م) کے زمانے میں اس کی وصولی کے لئے سخت اقدامات کرنے پڑے کہ ان دنوں خزانہ ہی مسلمانوں کی بنیادی ضروریات پوری کرتا تھا جو زکوٰۃ رک جانے کی وجہ سے ایسی صلاحیت سے قاصر ہو چلا تھا— اس طرح ان دنوں زکوٰۃ کا شعبہ خزانے کو بھرپور کمک پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ تھا پھر ایک وقت ایسا بھی آیا سیدنا عمرؓ (644م) و سیدنا عثمانؓ (655م) کے عہد میں افراد مملکت پر خوشحالی اور رفاہیت اتنی عام اور اس قدر فراواں ہونے لگی کہ کچھ وقت کے لئے وصولیات کا عملہ ہی رخصت کرنا پڑا— اور مسلمانوں کا یہ زریں دور واضح کرتا ہے کہ زکوٰۃ جیسا کثیر المنافع منصوبہ کسی طرح بھی مقصود بالذات نہیں تھا۔ حصول مقصد کا ایک ذریعہ تھا یعنی تربیتی اور عبوری دور میں جاں بلب مریض کو آکسیجن پہنچا کر زندگی کی رعنائیوں سے ہمکنار کرنا تھا جب اسے صحت مل گئی محتاج دوا نہ رہا۔

بلاشبہ زکوٰۃ اگر اجتماعی مفادات کے حصول کے لئے استعمال کی جائے تو بڑے کام دے سکتی ہے۔ غربت' افلاس اور جہالت کے بے قابو سیلاب کے آگے بند باندھا جا سکتا ہے— بڑے بڑے منصوبے تکمیل سے ہمکنار کئے جا سکتے ہیں لیکن افسوس کہ امت اسلام نے زکوٰۃ کے روشن اور تعمیری پہلوؤں کو نہیں دیکھا ان کی نظر صرف اس پر گئی کہ یہ صرف خیراتی منصوبہ ہے۔ ناقص آٹے کی بوریوں' زہر آلود گھی کے ڈبوں اور بیوہ عورتوں کو -/300 روپے ماہانہ وظائف کی ادائیگی سے کام چل سکتا ہے— حالانکہ اس طرح نہ صرف ناداروں کی عزت نفس سے کھیلنا اور زکوٰۃ کے کثیر المقاصد ہونے کا مذاق اڑانا ہے— ایسی زکوٰۃ جو مملکتی مستقبل کا سہارا نہ بن سکے اسلام کا مقصود بالذات نہیں ہو سکتی— ہاں یہ درست ہے کہ ایسی زکوٰۃ اڑھائی فیصد کے حساب سے کافی ہو سکتی ہے اور ملاں و سرمایہ دار کا مقصد بھی یہی ہے۔ جبکہ ایسی زکوٰۃ نہ تو معاشی نامرادی کا توڑ ہے اور نہ حتمی علاج ہے اور نہ ہی مقصود وحی قرآن۔ مقصود وحی یہ ہے کہ زکوٰۃ جیسے عبوری مگر مستقل وسیلہ کے سہارے مستقبل سازی کے مزید وسائل تلاش کئے جائیں— ہند کے بڑے صاحب علم ابوالکلام آزاد (1958م) نے اس نکتہ کا بخوبی احساس کیا اور لکھا کہ:

"شریعت کے ظاہری رسوم اور اعمال بھی اس لئے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو پس جہاں تک دین کا تعلق ہے ساری طلب مقاصد کی ہونی چاہئے نہ کہ وسائل کی۔"

(ترجمان القرآن طبع دوم جلد 266/1)

مالیات کا دوسرا اہم ذریعہ۔

اسلام مدنی دور میں زکوٰۃ کے پہلو بہ پہلو "انفاق" کا حکم بھی دہراتا چلا گیا ہے یہ زکوٰۃ سے جداگانہ اور غیر تعیناتی فنڈ ہے لیکن اسے چونکہ وحی قرآن نے خود ہی

ضابطہ "العفو" سے مربوط کیا تھا لہٰذا دولت مندوں کو تحفظ فراہم کرنے والی ایجنسیوں نے اسے غیر موثر بنانے کے لیے باور کرانا شروع کر دیا کہ زکوٰۃ ہی اصل حکم ہے اسے ادا کرنے کے بعد انفاق کی ضرورت ہی نہیں ہے اور یہ انحراف اس لئے روا رکھا گیا کہ انفاق میں ضرورت سے زائد مال—— افراد ملت کی ملک بن جاتا تھا جو نہ ملاں کو منظور تھا اور نہ ان کے آقایان ولی نعمت کو—— اس کے برعکس زکوٰۃ کے بارے میں وہ مطمئن تھے کہ ان کے خیال میں ایک تو وہ خیراتی ادارہ ہے دوسرا یہ کہ وحی قرآن نے اسے فرض حیثیت دے کر یہ نہیں فرمایا کہ کتنی مقدار وصول کی جائے؟ بلکہ اسے بہانہ بنا کر حسب حال بنانے کے لئے اپنے "جی" سے اڑھائی فیصد کی شرح مقرر کر ڈالی اور مسلمانوں کو باور کرانا شروع کر دیا کہ اللہ کا منشا صرف زکوٰۃ کا حکم ہی دینا تھا انفاق اور دیگر وسائل اس کی مشیت میں شامل ہی نہیں تھے۔ حالانکہ یہ لوگ اگر حقائق کو ملحوظ رکھتے تو ان پر واضح ہو جاتا—— کہ حکم کے بعد تفصیل سے تعرض نہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہر ملک اور ہر دور کی امت اپنی ضروریات کا اندازہ کر کے خود ہی کسی خاص مدت مثلاً پانچ سال کے لئے شرح کا تعین کرنے کی مجاز ہے لیکن ناداں ملاں—— حکم کی اس "دلم" کو نہ سمجھ سکا اور چند قطروں پر قناعت کر گیا کہ بس اڑھائی فیصد ہی کافی ہے اب اڑھائی فیصد ہی اگر منشائے وحی تھا تو وحی کے وہ صریح الفاظ کہاں ہیں جو ان کے زعم باطل کا سہارا بن سکیں۔ حدیث نبوی کی وہ وضاحت کس طرح ہے جو ان کے فیصد شرح کا اثبات کر دکھلاتی ہو—— اگر ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تو اڑھائی فیصد کو حکم شرع کہنے کی جسارت کیوں کی گئی؟

غنیمت اور "فے" کے تناظر میں

حیرت کی بات ہے کہ وحی قرآن غنیمت اور "فے" جیسے عبوری احکام کے لئے تو تقسیم کار کی تفصیل فراہم کرتی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور دنیا میں

عسکری نظام کی تکنیک بدل جانے سے غیر ضروری ہو کر رہ گئے ہیں یعنی اب نہ تو مومنوں میں مال غنیمت تقسیم کرنے کا سوال اٹھتا ہے اور نہ ہی دشمنوں کے پکڑے ہوئے مرد و عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح تقسیم و فروخت کیا جاتا ہے اور نہ ہی بیت المال کا الگ حصہ نکالنے کی ضرورت باقی رہی ہے — لیکن زکوٰۃ جو کہ کسی کی مناسبت سے دائمی اور کسی کی نسبت سے عبوری ہے — جسے یہ لوگ دیگر مدات سے الگ کر کے غربت کو دور کرنے کے لئے نسخہ شفا تجویز کئے ہوئے ہیں اس کی فی صد کا اوپر سے نہ وضاحت پیش کرتے ہیں نہ اشارہ اور نہ ایمائیت؟ آخر کیوں؟ کیا دین غیر مکمل رہ گیا تھا؟ وحی الٰہی سے سہو ہو گیا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ ارباب شرع نے سرمایہ داروں کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے دانستہ اسلام کی "زر شکن" پالیسی پر پردہ ڈالنے کی جسارت کی اور بات کو الجھاتے چلے گئے۔ اس طرح — ہر چیز — اللّٰہ کی ملک پانے کے اشاروں (Signals) کو سمجھنے کی جان بوجھ کر ضرورت محسوس نہیں کی اور سب تجاویز کو فضول یا منسوخ ٹھہرا کر زکوٰۃ کی خود تجویز فی صد کو گوہر مقصود ٹھہرا کر ہمیشہ کے لئے اللّٰہ و رسول کی منشاء کو محدود کر ڈالا۔

کتنی مالیت پر زکوٰۃ ہے؟

قرآن نے مسلمانوں کی ہر چیز کو جب اللہ کی ملکیت قرار دیا ہے اور انفاق وغیرہ کے قوانین نے بھی ضرورت سے زائد ہر چیز کو ملت ہی کے مقدر کی چیز ٹھہرایا ہے تو کیا وجہ بنی کہ زکوٰۃ کے لئے پہلے نصاب اور اس کے بعد فی صد کی غیر متوازن شرائط مقرر کر کے اس کی افادی حیثیت کو ختم کر دیا گیا کیونکہ عہد نبویؐ میں اگر اس کے نصاب اور پھر فی صد کا فیصلہ نہ ہو سکا تھا یا خلفائے ثلاثہ — فی صد کے تناسب کو غیر ضروری سمجھتے تھے تو بعد کے مسلمان اہل فکر کا فرض بنتا تھا کہ اس مسئلہ کو سنجیدگی سے لیتے اور ہر دور کے لئے قابل قبول اور حسب حال نصاب اور فی صد کی صورت نکال لیتے۔

یہ لوگ کہتے چلے آئے ہیں کہ ساڑھے سات تولے سونا اور ساڑھے باون تولے چاندی کسی کو میسر ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے لیکن ہند کے ابو یوسف ـــ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی (1887م) کی تحقیق کے مطابق 36 تولے اور چار رتی چاندی جس کے پاس ہو وہی صاحب نصاب ہے اور اس پر ہی زکوٰۃ واجب ہے ـــ (عمدۃ الرعایہ طبع انوار محمدی لکھنؤ سنہ 1303ہجری جلد 34/2) ـــ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ نصاب کی بات طے شدہ نہیں ہے۔ متقدمین اہل تحقیق بھی کسی متفقہ فیصلہ پر نہیں پہنچ پائے۔

اڑھائی فیصد کا ماخذ

"حارث اعور نے حضرت علیؓ کے نام پر مشہور کر رکھا تھا کہ "چاندی کے ہر دو سو درہم پر جب سال گزر جائے تو پانچ درہم زکوٰۃ واجب ہے۔"

(ابو داؤد طبع دوم مصر 1953 جلد 135/2)

یعنی فی صد درہم پر اڑھائی درہم زکوٰۃ ہے ـــ یہ روایت کیسی ہے؟ وضاحت آئندہ ملے گی ـــ لیکن بات پھر بھی تشنہ رہ گئی کہ خود درہم کون سا معیاری اور سکہ بند تھا کیونکہ یہاں راوی نے اہل تحقیق کے وارد کردہ ٹیکنیکل اعتراضات کا پیشگی اندازہ کر کے کوئی جواب تیار نہیں کیا ـــ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں آنے والوں نے حارث کی تجویز کا اعتراف ہی نہیں کیا خود روایت کے مصنف امام ابو داؤد (879م) نے برملا کہہ دیا کہ:

"یہ روایت حضرت علیؓ پر موقوف ہے رسولؐ اللہ سے مروی نہیں ہے۔"

(ابو داؤد طبع مصر جلد 3/135/2 تا 4)

اور موقوف روایت کے بارے میں اہل فن اور محدثین کا جو مسلک ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے کہ حجت نہیں ہے۔

(مقدمہ نووی شرح مسلم صفحہ 18 سطر 24 تا 26)

بنا بریں یہ روایت کسی شرعی ماخذ کی حیثیت نہیں رکھتی یعنی کہ اس باب میں جو اکلوتی روایت تھی وہ بھی نہ صرف نامقبول اور موقوف ہے — حارث پر تنقیدات کی روشنی میں وضعی بھی ہے — یہ علاوہ اس کے کہ درہم کون سا معیاری ہے کیونکہ اسی وجہ کو سامنے رکھ کر مالیات کے ماہرین درہم کے معیار کے فقدان کو بھی زیر بحث لائے ہیں — امام عبد الملک بن حبیب اندلسی (857م) نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ — ان کل اهل بلد يتعاملون بدراهمهم

> یہ جو کہا جاتا ہے کہ چاندی کے دو سو درہم زکوٰۃ کے نصاب کو پورا کرتے ہیں تو یہ خلاف واقع ہے کیونکہ ہر ملک اپنے ہاں رائج درہموں میں لین دین کرتا اور ان ہی سے وزن کا کام لیتا ہے چنانچہ جو درہم بغداد میں چلتے ہیں سپین میں ان سے مختلف وزن کے رائج ہیں۔

(فتح الباری طبع سلفیہ جلد 35/3)

ابن حبیب کی اس تحلیل کو حدیث کے مشہور امام عبدالبر (1071م) نے بھی تسلیم کیا ہے اور مختلف ممالک کے دراہم کا سپینی درہموں کے وزن سے مختلف ہونے کا اعتراف کیا ہے —

(فتح عبدالباری 35/3)

اسی طرح بشر بن غیاث مریسی (823م) جس پر فتح الباری کے مصنف حافظ ابن حجر (1449م) ضرورت سے زیادہ خفا ہیں کہ انہوں نے علماء کے اجماع کو چیلنج کیا ہے وہ بھی دو سو درہم کے نصاب کو ویٹو کرتے اور کہتے تھے کہ مختلف ممالک کے دراہم مختلف وزن کے ہوتے ہیں لہٰذا چاندی کے وزن کے بہ نسبت دراہم کے عدد سے کام لیا جائے —

(فتح الباری 35/3)

ابن غیاث کا مفہوم یہ ہے کہ درہم کا وزن کہیں تو کم ہے اور کہیں زیادہ لہٰذا وزن کی بات نہ ہونی چاہیے — عدد کو ملحوظ رکھا جائے — شافعی مسلک کے بڑے فقیہ اسماعیل بن ابراہیم (1448م) نے بھی اختلاف کے زاویئے کو اجاگر کرتے

ہوئے واضح کیا ہے کہ ایک دانہ بھی چاندی کی مقدار سے اگر کم ہوا تو ظاہر ہے کہ نصاب کی فرضی شرط پوری نہ ہو سکے گی۔

(فتح الباری 35/3)

اجماع امت کی دہائی۔

یہ تمام اختلافات خود ابن حجر ہی نے پیش کئے ہیں اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ اختلافات جائز ہیں اور اختلافی امور پر اجماع کا اطلاق اصولی طور پر غلط ہے۔۔۔ اس کے باوصف انہوں نے **مریسی** کو اجماع شکنی کے الزام میں آڑے ہاتھوں لیا اور نشانہ تضحیک بنایا ہے حالانکہ ہمارے **ابن حجر** کی ذمہ داری تھی کہ اجماع امت کا بھرم رکھنے کے لئے کوئی ایسی "**توجیه**" سامنے لے آتے جو معقولیت کی آئینہ دار بھی ہوتی اور مستقبل کے مسلمانوں کے لئے نظیر بھی بن سکتی لیکن وہ ایسا کرنے سے قاصر تھے کہ اس نظریئے کے بانی حارث اعور خود بھی فکر رسا سے محروم تھے۔

جھوٹ پر یقین کی عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی۔

فرض کرو اپنے دور کی ضروریات کا اندازہ کر کے اگر حارث کے بقول حضرت علیؓ ہی نے کچھ فیصد کا تعین کیا تھا تو بھی اس کے لئے کم از کم عہد نبویؐ اور عہد **خلفائےثلاثه** کی اگر کوئی نظیر پیش کی جاتی یا کی جاسکتی تو بھی ذریعہ اطلاع مضبوط اور ثقہ ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور جس راوی کے سہارے اتنا اہم مسئلہ واضح کیا جاتا ہے وہ اچھی شہرت کا مالک نہیں تھا۔۔۔ حارث الاعور نامی راوی دروغ گو اور نہایت ناپسندیدہ شخص تھا یہ دم تو حضرت علیؓ ہی کا بھرتا تھا مگر حقیقت میں آپ کی بدنامی کا موجب بنا ہوا تھا۔۔۔ فن رجال کے بڑے نقاد عامر شعبی، **محمد بن سیرین** اور حارث کے اپنے ہی شاگرد ابو اسحاق کہتے تھے کہ اصحاب علیؓ میں حارث غالی قسم

کا جھوٹا اور دروغ گو تھا۔۔۔ مغیرہ نے کہا کہ اس امت میں سب سے زیادہ جھوٹ حارث نے بولے اور حارث ہی نے اس مقصد کے لئے حضرت علی کو اکسپلائٹ کرنے کے لئے چن لیا تھا۔ وہ ہر جھوٹ حضرت علیؓ کے حوالے سے بولتے اور مشتہر کرتے۔ قدماء نے حارث کے تخریبی رویہ کو دیکھتے ہوئے تمام ان روایات کی نفی کی ہے جو حضرت علی کے حوالہ سے اس نے روایت کیں ۔۔۔ جن میں زیر بحث روایت بھی ہے۔۔۔ منصور' ابن المدینی اور جریر بن عبدالحمید اسے قطعی جھوٹا اور دھوکا باز کہتے تھے۔ ابن معین' نسائی اور دار قطنی اسے درجہ ثقاہت سے فروتر ٹھہراتے تھے' ابن عدی' علقمہ اور بنداد۔۔۔ رجال کی خاص اصطلاح میں اسے غیر محفوظ اور ناقابل اعتبار کہتے تھے اس کے دل آزار رویہ سے سنی مکتبہ فکر ہمیشہ نالاں اور شاکی رہتا تھا۔۔۔ اس نے ایک بار مرۃ (Murrat) الہمدانی کے سامنے یاران پیغمبر اور ازواج مطہرات کے بارے میں ناشائستہ زبان استعمال کی تو مرۃ نے کہا تم بیٹھو میں آ رہا ہوں چنانچہ وہ اندر گیا اور تلوار سونت کر نکلا لیکن اتنے میں حارث کی چھٹی حس بیدار ہو چکی تھی۔۔۔ وہاں سے بھاگ نکلا تاہم صرف یہ واقعہ ہی زیر بحث روایت کو جھٹلانے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اسے جھوٹ تسلیم کرنے کے لئے محدثین کی وہ ریسرچ اور تحقیق ہے جو حارث کو حضرت علیؓ کے راوی ہونے کو جھٹلاتی ہے۔

حارث کے ضمن میں اہل فن کے یہ ریمارکس کہ۔۔۔ اس نے حضرت علیؓ سے جتنی بھی روایات کیں جعلی اور اسکی خود تراشیدہ ہیں۔۔۔ روایت ہذا کی پوزیشن متعین کرنے کے لئے کافی ہیں خاص کر اگر اڑھائی فی صد۔۔۔ دین کا مسئلہ ہوتا تو ہر ایک کو معلوم ہوتا۔۔۔ اس صورت میں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم اور ایک کے سوا۔۔۔ ایک لاکھ سے متجاوز۔۔۔ رفتہ اور زندہ صحابہ رسول صلی اللہ علیہ و سلم سے اسکا ثبوت فراہم کیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ جن لوگوں کا عقیدہ ہے کہ دین رسول اللہ کے بعد بھی مکمل ہوتا رہا انہوں نے اتنی جرح کے باوصف حارث کی روایت کو قبول بھی کیا ہے اور یہ نہ سوچا کہ وہ محدثین کی اس جرح کا جواب فراہم

نہیں کر سکتے کہ حضرت علیؓ کے حوالے سے حارث کی تمام روایت جھوٹ کا پلندہ ہیں اور ہمارے موقف کی مضبوطی کے لئے حارث کے خلاف اتنا سرٹیفکیٹ کافی ہے کہ وہ اول درجہ کا جھوٹا تھا۔

کچھ لوگوں نے اڑھائی فی صد۔کے جھوٹ کو اعادے اور تکرار کی تکنیک سے سچ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے یعنی یہ جو افواہ کی نفسیات ہے کہ جھوٹ کو اتنا دہراؤ کہ یقین میں بدل جائے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حارث کے پیر بھائی عاصم بن ضمرہ نامی راوی کے سامنے لانے کی کوشش بھی کی ہے حالانکہ عاصم کا حال بھی زیادہ پتلا اور ناقابل افاقہ ہے وہ نہ خود صحت ور ہے اور نہ ہی اس روایت کو صحت دے سکتا ہے—— یہ تو اتنا کمزور ہے کہ شدید تنقیدات کا بوجھ سہار ہی نہیں سکتا یہ اتنا درماندہ اور جھوٹ کی بیساکھیوں پر چلنے کا عادی ہے کہ خود اپنے بھی اسے آخری سٹیج کا مریض سمجھتے تھے خاص کر اس کی بھی ان ہی روایات کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے جو حضرت علیؓ کے ناطے سے مروی ہیں یعنی کہ نصاب اور سال گزرنے کی زیر بحث روایت کے لئے دوسرے جس راوی کو سامنے لایا گیا ہے وہ بھی اپنی روایت میں کسی طرح کی توانائی اور روشنی پیدا نہیں کر سکا—— بلکہ فن رجال کے ماہرین نے حضرت علیؓ کے حوالہ سے روایت سازی کی جو فرد جرم حارث پر لگائی تھی وہی فرد—— عاصم پر بھی عائد کر دی ہے—— اب جہاں یہ روایت حارث کی وجہ سے وضعی مشہور ہوئی وہاں عاصم کی وجہ سے بھی خود ایجاد ہی شمار ہو گی اور میرے نزدیک عاصم کے غیر معتبر ہونے پر یہ شہادت کافی ہے کہ اس کی ایک روایت کو اس بنا پر مسترد کر دیا گیا کہ وہ روایت اس کے ذریعہ ہی نمودار ہوئی وہ کہتے تھے کہ—— **اما كان الصحابه و امهات المومنين يحكمون بهذا اذهم معه فى جدهم**——

کیا اڑھائی فی صد والی روایت صحابہ اور ازواج مطہرات کو نہ مل سکتی تھی—— تاکہ وہ بھی اس پر عمل پیرا ہو کر تکمیل دین کے گواہ بن سکتے—— خاص کر وہ سب دین کی جدوجہد میں ہمیشہ آپ کا ہاتھ بٹاتے بھی رہے۔ اسی عاصم کے بارے میں نقد رجال کے بڑے امام—— ابن عدی' مغیرہ اور ابو اسحاق کہتے تھے کہ اس کی وہ تمام

روایات جو حضرت علی کے حوالہ سے مروی ہیں' جھوٹ اور خود اختراعی ہیں—— محدثین اس کی صفائی بیان کرنے سے قاصر ہیں تاہم یہ حارث کی بہ نسبت محتاط دروغ گو تھے—— لیکن ہم کیا کریں کہ ماضی اور حال کے جھوٹوں نے مل کر حضرت علیؓ ہی کے دامن میں کیوں پناہ لی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ دین کا متبادل آپ ہی کے توسط سے سامنے لانا مقصود تھا۔

حدیث اور اثر میں فرق

یہاں اس مغالطہ کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ لوگوں نے حضرت علیؓ کے "اثر" کو حدیث نبویؐ سمجھا ہو حالانکہ حدیث اور اثر میں فرق نمایاں ہے کہ حدیث کی نسبت رسولؐ اور اثر کی اضافت صحابی یا تابعی کی طرف ہوتی ہے اور یہ مسلمہ اصول ہے کہ دین کی تکمیل نہ حدیث سے ہوئی ہے نہ کسی اثر سے۔ دین میں اگر کوئی تشنگی رہ جاتی تو زبان وحی کو تکمیل کا اعلان نہ کرنا پڑتا۔ پھر یہ مستزاد کہ اس طرح کا مواد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم خلفائے ثلاثہ بلکہ تمام صحابہ سے کسی بھی باوثوق ذریعہ سے نقل نہیں ہوا اور نقل نہ ہونا واضح کرتا ہے کہ کم از کم حرمین شریفین والے تکمیل دین کے اس اضافے سے بے خبر تھے اور ان کا نہ جاننا ثابت کرتا ہے کہ اس روایت کی اصل ہے نہ اساس—— جنوبی عراق میں کوفے کی ٹکسال میں ڈھلی اور لوگوں میں پھیلی—— مشتبہ اور مشکوک تھی' مشتبہ اور مشکوک رہے گی یہ مستقبل کے کسی بھی چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وضاحت عنوان "نصاب کی بات" میں آ رہی ہے۔

امام العصر محمد عبدہ' کا فکر انگیز تجزیہ

امام العصر محمد عبدہ' (1905م) ایک بالغ نظر عالم اور عصری تقاضوں کا

بخوبی ادراک کرنے والے مفکر تھے آپ سال گزرنے اور نصاب کی شرط کو زکوٰۃ کی اہمیت ختم کرنے کی تمہید قرار دیتے تھے ان کا استدلال ہے کہ:

وحی الٰہی نے بیسیوں مقامات پر زکوٰۃ کے حکم کو دہرایا اور درجنوں بار ذکر کیا ہے مگر کسی ایک مقام پر بھی زکوٰۃ کے ساتھ نصاب اور سال گزرنے کی شرط کو بیان نہیں فرمایا آخر کیا وجہ بنی کہ اتنے اہم معاملے میں وحی الٰہی خاموش رہی۔

(تفسیر المنار جلد 118/2)

امام العصر کا مفہوم یہ ہے کہ زکوٰۃ کے وسیع تر مفہوم کو محدود اور سرمایہ داروں کے حسب حال بنانے کے لئے ہی یہ شرطیں عائد کی گئی تھیں۔ بنابریں علما کے موقف سے اختلاف کرتے ہوئے واشگاف طور پر اسے "فراڈ" قرار دیا ہے فرماتے ہیں——

تلک الحیل الشیطانیه لم یجد لها واضعوها شبهة من تحریف کتاب الله و تاویل آیاته کما هی طریقتهم فی اتباع اهوائهم و تائید آرائهم فان الله تعالی لم یذکر فی کتابه—— الحول—— والنصاب و انما ذکر ماهو روح الدین و مقصده وهوایتاء الزکوه وکونه آیة الایمان و ترکه آیة النفاق و الکفران۔

زکوٰۃ حذف کرنے کے یہ شیطانی حیلے اختراع کنندگان نے اس لئے اختیار کئے کہ اس طرح کتاب اللہ کا حکم ابہام کے جبڑوں میں دے کر پھر اس کی آڑ میں تحریف و شبہات پیدا کرنے کا وطیرہ اپنائیں اور حقائق کو اپنی ہوائے نفس کے تابع کر دکھلانے کے لئے تاویل کے پٹ کھول دیں۔ لیکن کتاب اللہ ان کی باتوں کی ذمہ داری قبول نہیں کرتی کیونکہ اللہ سبحانہ نے اپنی پوری کتاب میں سال گزرنے اور مالیت کی مفروضہ حد تک پہنچنے کی شرائط کو کہیں بھی ذکر نہیں فرمایا اس میں تو صرف "دین" کی روح اور مقصد پر زور دیا گیا ہے کہ زکوٰۃ (بے حیل و حجت) ادا کر دیجائے کہ عدم ادائیگی منافقت اور بغاوت ہے۔

(تفسیر "المنار" طبع سوم مصر جلد 118/2'

(119

امام العصر کا مفہوم واضح ہے کہ نصاب اور سال گزرنے کی شرط سے سرمایہ داروں کو زکوٰۃ بچانے کا چانس فراہم کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ وحی قرآن نے اپنے الفاظ میں نہ سال گزرنے کی شرط رکھی ہے نہ مالیت کی مقدار سے بحث کی ہے اور نہ ہی یہ کہ کتنے مال پر کتنی زکوٰۃ ہے؟ بلکہ اسے غیر متعین چھوڑ دیا— چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے اپنے عہد مبارک میں حالات و ضروریات کے تناظر میں اپنی صوابدید سے جتنا مناسب سمجھا وصول فرمایا۔ لیکن اب ہماری ضروریات کا نہ وہ پیمانہ ہے اور نہ ظرف ہم اپنے زمانے میں دیکھیں گے کہ آیا زکوٰۃ کی مفروضہ شرح (اڑھائی فی صد) ہماری ضروریات کی کفالت کر سکتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں کرتی تو— ہم قانون انفاق کی ضو میں مفروضہ رائج شرح پر نظر ثانی اور رد و بدل کے مجاز ہوں گے اور حالات کے مطابق ہر وقت مناسب شرح کا صوابدیدی حق استعمال کرتے رہیں گے۔ قرآن نے صنعتی و تجارتی پیداوار کی طرح زرعی پیداوار پر بھی غلہ یا نقد صورت میں مالیانہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے (انعام' 141) مگر وہاں بھی صوابدید ہی سے مربوط فرمادیا ہے۔ کیونکہ یکساں شرح نہ ہو سکتی تھی خاص کر زراعت کا بارانی' کاریزی' نہری اور چاہی پانی پر انحصار پر ہے اور ان میں صرف بارانی پانی ہی کم مشقت سے میسر آتا ہے جس پر پیداواری محصول غالباً 20 فی صد لیا جاتا رہا ہے— کہنے کا مقصد یہ ہے کہ محصولات کی جو بھی نوعیت ہو گی صوابدیدی اور بار بار تخمیناتی ہو گی۔

شیطانی حیلے

قرآن محکم نے زکوٰۃ کی شرح سے تعرض نہ فرما کر مطلق چھوڑ دیا ہے— دنیا پرست علماء اور اصحاب زر نے اس اطلاق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی ادائیگی سے بچنے کے بہانے تراشنا شروع کر دیئے— امام العصر لکھتے ہیں **المخذولین لما تركوا الاهتداء بالكتاب والسنة وجعلوا عبارات الكتب التي صنعوها هي ماخذ**

الدین و بنابیه صاروا یحتالون فی تطبیق اعمالهم علی تلک العبارات المخلوقة فیکتب احدهم مثلا تجب الزکوه علی مالک النصاب اذاتم الحول و هو مالکهٗ ثم یعد هو وغیره الی تطبیق دینه علی هذه العبارات فیهب ماله قبل انقضاء الحول بیوم اوبیومین الی امراته ولو مع الاشتراط علیها ان تعیده له بعد یوم او یومین و یقول انه لم یجب علیه الزکوه بحسب نص الکتاب الذی سماه انفقها۔ و یدکّ بکلمة الکتاب المخلوق کتاب الله القدیم۔

خدائی خوار ملاؤں (المخذولین) نے خدا اور رسولؐ کی ہدایت سے پیچھا چھڑاتے ہوئے جن کتابوں کو خود لکھا اور مفروضوں کو تخلیق کیا انہوں نے ہی اپنی تخلیقات کو دین کا ماخذ اور سرچشمہ بنا ڈالا—— بلکہ اپنی روسیاہیوں اور خود نوشتوں (العبارات المخلوقة) سے ہم آہنگ کر دکھلانے کے لئے کہنا شروع کر دیا کہ—— زکوٰۃ تو ایسے شخص پر واجب ہے جس کے مال پر ایک برس گزر جائے اور وہ مال اس کے قبضے میں بھی ہو—— اس بہانے وہ زکوٰۃ کے ایک بنیادی حکم کو غیر موثر بنانے کے لئے سال گزرنے سے ایک—— یا—— دو دن پہلے تمام مال اس شرط پر بیوی کو ہبہ کر دیتا ہے کہ اسے دو یا ایک دن بعد واپس لے لے گا اس طرح یہ حیلہ سازیاں سرانجام دینے کے بعد وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ فی الواقع اس پر زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہوئی—— لیکن یہ حرکت سرانجام دے کر وہ دین کے ایک بنیادی حکم اور اللہ کی قدیم کتاب کو ایسی کتاب سے دے مارنے کی جسارت کرتا ہے جو خود ان کی اپنی تخلیق ہے اور جو تمام فقیہ مصلحت بین کے افکار کی رہین منت ہے۔

(المنار طبع قاہرہ 1368ہجری جلد 2/119)

حیلہ گر اصحاب شرع نے تمام تر یہ حیلے یہود کے احبار و رہبان سے اخذ کر لئے تھے کہ وہ بھی "سبت" (Saturday) کے دن شکار نہ کرنے کے حکم سے بچنے کے لئے جمعہ ہی کو مچھلیوں کو ہانک کر تالاب میں جمع کرتے اور خیال کرتے کہ انہوں نے اصل حکم کی خلاف ورزی نہیں کی——

ناظرین محترم—— حیلہ گروں کے ان حیلوں سے بچنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ و سلم کے جلیل القدر صحابی حضرت امیر معاویہ ؓ (680م) نے صحابہ کے مشورے سے اور امت کے بڑے امام جناب ابو حنیفہ (767م) نے سال ختم ہونے سے پہلے ہی زکوٰۃ وصول کرنے کا فیصلہ کر کے ان کا "کو" باندھ لیا تھا—

نصاب کی بات

صاحب مالیت کے پاس کتنی مالیت کا سونا و چاندی ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہے؟ اس کی بابت واضح کیا جا چکا ہے کہ فقہا میں اختلاف ہے ساڑھے چھتیس تولے چاندی کا نصاب ان کا آخری فیصلہ ہے ویسے ساڑھے باون تولے' تو ہے ہی لیکن ان کے تجویز کردہ نصاب کی مالیت میں نہ تو یکسانیت ہے اور نہ معقولیت کیونکہ آج کے حساب سے چاندی ساڑھے چھتیس تولے کی قیمت -/3300 روپے اور سونے ساڑھے سات تولے کی قیمت -/39000 روپے ہے— ادھر مشاہدہ یہ ہے کہ چاندی عام طور پر غریب یا متوسط لوگ ہی استعمال میں لاتے ہیں اور سونا خوشحال لوگ— اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ زیادہ بوجھ سرمایہ داروں پر ڈال دیا جاتا مگر فقیہ شہر نے یہاں بھی خوشحال لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی ٹھان رکھی ہے کہ غریب تو سوا تین ہزار روپے کی مالیت بھی نہ بچا سکے مگر امیر انتالیس ہزار ہضم کر ڈالے— اور چونکہ نصاب ان سائنٹیفک اور غیر معقول ہے لہٰذا اس کی شرعی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے خاص کر اڑھائی فی صد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اور صحابہ کرام ؓ بالکل ہی لاعلم تھے محدثین کے بڑے پشتیبان اور حدیث نبوی کے وکیل حافظ ابن حجر (1449م) کو تسلیم ہے اور صاف لکھتے ہیں کہ— **ان الدرھم لم یکن معلوم القدر حتی جاء عبدالملک بن مروان فجمع العلماء فجعلوا کل عشرۃ دراھم سبعۃ مثاقیل۔**

> عبدالملک بن مروان (705م) کے زمانے تک درہم کا وزن طے شدہ نہیں تھا عبدالملک نے اہل علم کو جمع کر کے فیصلہ طلب کیا انہوں

نے حالات کا جائزہ لے کر ہر دس درہم کو سات مثقال کے برابر قرار دے کر ایک گونہ وزن کا تعین کر دیا۔

(فتح الباری طبع سلفیہ قاہرہ جلد 3/310'311)

یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم اور صحابہ کرامؓ کے نزدیک درہم کا وزن بھی ایک نامعلوم چیز تھی — کیونکہ خود درہم بھی مختلف وزن کا ہوتا تھا۔

یہ ایک زبردست حقیقت ہے جو کہ ابو عبیدہ کے حوالہ سے ابن حجر نے منکشف کی ہے لیکن افسوس کہ وہ اپنے انکشاف سے مطمئن نہیں — اس کی "چوٹ" محسوس کرتے ہوئے قاضی عیاض (1149م) کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

> "ایسا ناممکن ہے اگر درہم کا کوئی مقررہ وزن تسلیم نہ کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم بھی نامعلوم الوزن درہموں کو نصاب بنا گئے تھے" (حوالہ مذکورہ)

> ابن حجر اور قاضی عیاض کو ابو عبیدہ (826م) کے انکشاف پر اعتراض تھا تو انہیں چاہئے تھا کہ نبوی عہد کے کسی درہم کا وزن سامنے لے آتے صرف اس "احتمال" پر یقین کی عمارت استوار کرنا کہ ایسا ناممکن ہے' ایک احتمال تو ہو سکتا ہے دلیل نہیں بن سکتا اور ہم وثوق سے کہتے ہیں کہ احتمال ہے اور احتمالات کے ناتواں شانے حقیقتوں کا بوجھ نہیں سہار سکتے۔

درہموں کے وزن یکساں نہیں ہوتے تھے

ابوعبیدہ اور اس سے پہلے حبیب اندلسی اور بشر بن غیاث' ابن عبدالبر اور اسماعیل تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں کہہ چکے ہیں کہ علاقوں اور ریاستوں کے درہم اور دینار یکساں وزن کے نہیں ہوتے تھے بلکہ ایک ہی ملک اور ایک ہی عہد

کے سکوں کا وزن بھی سائنٹیفک نہ ہوتا تھا آج تو کمپیوٹرائزڈ کنڈے موجود ہیں لیکن گزشتہ کئی صدیوں سے بٹے اور اوزان اتنی دقت اور باریکی سے ڈھالے جاتے تھے کہ "ہوا" کا وزن بھی بتا دیتے تھے لیکن زمانہ قدیم میں ایسی احتیاط و باریکی سے کام نہیں لیا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ اسلاف کسی متفقہ یا قابل قبول وزن پر متفق نہ ہو سکے — خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے زمانے میں جو درہم اور دینار مستعمل ہوتے تھے وہ شام کے ہرکولیس اور مصر کے مقوقس کے نام کے ہوتے تھے آپ ؐ نے ان کا قانونی اعتراف کر کے مملکت اسلامیہ میں قابل استعمال گردانا تھا — مکے اور مدینے کے بازاروں میں ان ہی کے ذریعہ — لین دین ہوتا تھا لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے نہ تو نصاب کا سوال اٹھایا اور نہ ہی شرح کا — جہاں تک عبد الملک کے اسلامی سکوں کا تعلق ہے تو ماہرین آثار قدیمہ نے اس کے سونے کے دیناروں کی تفصیل اس طرح دی ہے جن میں ہم وزنی کا بالکل ہی فقدان ہے اور ان ہی پر درہموں کے اوزان کی ناہمواری کا بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

عبدالملک کا دور 65 ہجری سے شروع ہو کر 89 ہجری پر ختم ہو جاتا ہے ان اکیس سالوں میں آپ نے جو دینار ڈھالے انکی تفصیل اس طرح ہے۔

79ھ کے دینار کا وزن 2/78 گرام اور قطر 19 ملی میٹر ہے
80ھ کے دینار کا وزن 4/312 گرام اور قطر 20 ملی میٹر ہے
83ھ کے دینار کا وزن 4/254 گرام اور قطر 19 ملی میٹر ہے
84ھ کے دینار کا وزن 4/25 گرام اور قطر 40 ملی میٹر ہے
86ھ کے دینار کا وزن 4/252 گرام اور قطر 20 ملی میٹر ہے نیز
86ھ کے دینار کا وزن 2/015 گرام اور قطر 19 ملی میٹر ہے

اس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے زمانے میں ہرکولیس کے جو دینار مستعمل تھے وہ بھی یکساں وزن کے نہیں تھے مثلاً ایک دینار کا وزن اگر 4/26 گرام یعنی 66 دانے (Grains) تھا تو اسی ہی کا دوسرا دینار 4/50 گرام کا بھی تھا پس جب ایک ہی سلطنت کے ایک ہی معیار کے سکوں کے وزن میں باقاعدگی نہیں تھی

تو مختلف ممالک کے سکوں اور کرنسیوں کے معیار اور تبادلے کے نرخوں میں جو فرق تھا وہ کیونکر نظرانداز ہو سکے گا لہٰذا ضرورت ہے کہ اسلامی حکومتیں زکوٰۃ کی فرسودہ تفاصیل پر نظرثانی کریں۔

زکوٰۃ کی شرح معروضی حالات کے تابع ہے

ہرگاہ کہ سید البشر صلی اللہ علیہ و سلم سے لے کر عبدالملک کے عہد تک کوئی فی صد یا شرح معلوم القدر نہیں تھی خود عبدالملک نے جو نقود ڈھالے تھے ان سے بھی شرح کا پتہ نہیں چلتا تو ایسے میں اڑھائی فیصد شرح کا تعین غیر معقول اور غیر علمی انداز فکر ہے —— ہو سکتا ہے کہ جس مبہم زمانے میں جبکہ زندگی کی ضروریات محدود' منصوبے اور سکیمیں مفقود ہوں نہ سکول ہوں نہ کالج نہ سڑکیں ہوں نہ شفاخانے' نہ سرکاری دفاتر ہوں نہ عسکری مراکز تب اڑھائی فی صد سے کام چل جاتا ہو لیکن آج تو اس سے کوئی ضرورت مند بیڑا اور نسوار بھی نہیں خرید سکتا —— اس سے تو بہتر ہے کہ زکوٰۃ کی دکان ہی بڑھادی جائے —— لیکن زکوٰۃ اسلام کا مالیاتی اور کثیرالمنافع نظام ہے اسے نہ ختم کیا جا سکتا ہے نہ حیلہ گروں کی بدعنوانی سے معطل یا غیر موثر بنایا جا سکتا ہے بلکہ ہر دور میں حالات و ضروریات کے مطابق اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ اور انفاق الٰہی ضابطے ہیں جو سراسر معروضی حالات کے تابع ہیں —— نادار اور وسائل معیشت سے محروم لوگوں کا حق بنتا ہے کہ انہیں ان مدات سے کمک پہنچا کر اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جائے —— نادار مرد اور عورتیں جو کام کرنے کی سکت نہیں رکھتے' انہیں معاشرے کے معیار کے مطابق اس قدر وظیفہ دیا جائے کہ آسانی سے گزر بسر کر سکیں اور جو صحت مند افراد وسائل نہیں پاتے انہیں دستکاری یا کاروباری سنٹروں میں چند ماہ ٹریننگ دے کر روزگار مہیا کیا جائے یعنی تجربہ حاصل کرنے کے بعد انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے کسی دیانتدار کمیٹی کی زیر نگرانی اتنا پیسہ دیا جائے کہ اس کا کام چل سکے اور اگلے سال زکوٰۃ دینے والوں

میں شامل ہو۔ لیکن یہ تمام امور اس وقت ہی ثمر آور ہو سکتے ہیں جب پاکستان میں قرآن کے داخلہ کو بھی ممکن بنا دیا جائے اور اسکی حاکمیت کو تسلیم بھی کیا جائے۔۔۔ قرآن اگر ماضی کی طرح پاکستان کے لئے اجنبی ہے تو ناممکن ہے کہ آپ کسی بھی مرحلے پر زکوۃ کی محدود فی صد کے ذریعے غربت اور افلاس کا تدارک کر پائیں۔۔۔ اس سے بھکاریوں کی فوج تو تیار ہوتی رہے گی مگر کسی غیرت مند قوم کا روپ اختیار کرنا ناممکن ہی رہے گا۔۔۔ جب بندے بھی اللہ کے ہیں اور مال بھی اللہ کا تو کیا رکاوٹ ہے کہ آپ حب زر کے گرویدہ ہو کر اڑھائی فی صد کی شرح کو جزو ایمان بنائے رکھیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ایک بڑے آدمی سے 6 ارب روپے کی زکوۃ (15 کروڑ روپے) لے کر دینی مدرسوں تک پہنچا دیں تو باقی 5 ارب 85 کروڑ روپے بالکل محفوظ ہو جائیں گے نہیں ایسا نہیں ہو سکتا نحل (71) کی رو سے کوئی بھی شخص 15 کروڑ دے کر 5 ارب 85 کروڑ کا غیر مسئول مالک نہیں بن سکتا۔۔۔ مفلس قوم کے خزانے کو ان پیسوں کی بڑی ضرورت ہے۔ دفاع کے لئے ضرورت ہے' صحت کے لئے ضرورت ہے اور تعلیم کے لئے ضرورت ہے۔ کیا ان تمام ضروریات کی تکمیل نہ کرنے سے اپنی حفاظت کر سکتے ہیں؟ ناممکن۔۔۔ امام ابن حزم (1064م) اندلسی اپنی فقہی انسائیکلو پیڈیا "المحلیٰ" طبع منیریہ قاہرہ کی چھٹی جلد میں لکھتے ہیں۔۔۔ فی مالک حق سوا الزکوٰۃ۔۔۔ زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد بھی زکوٰۃ نکالے مال میں "ملت" کا حق ہے۔۔۔ وہ ضرورت کے مطابق سارا لے سکتی ہے۔

(المحلّٰی 159/6)

کیونکہ زکوۃ کے بعد کالا دھن تو سفید ہو سکتا ہے سرمایہ دار کی جاگیر نہیں بن سکتا۔۔۔

علومِ قرآنی میں ایک عظیم انقلاب

☆ایک حجت ☆ایک دلیل ☆ایک برھان☆

تفسیر منسوخ القرآن

قرآنی علوم کی صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ میں اپنی نوعیت کی اولین کتاب

جس میں پہلی بار قرآن محکم میں ناسخ و منسوخ آیات سے بے شمار علوم کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور علم و منطق کی روشنی میں ہزاروں عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ قطعی طور پر ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں نہ الفاظ کا تغیر و تبدل واقع ہوا ہے اور نہ معانی و مفاہیم میں کسی طرح کا نسخ۔ اس معرکہ آراء کتاب میں ان تمام عظیم مسلمان مفکرین کی آراء کو جمع کیا گیا ہے جو قرآن کی راہنمائی کو ہر اعتبار سے برحق ثابت کرتے اور **نسخ فی القرآن** کے باطل نظریہ کو روح اسلام اور نفسیات وحی کے منافی قرار دیتے ہیں۔ **احکام القرآن** کے موضوع پر اس سے جامع مدلل اور سنجیدہ علمی کتاب اردو زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ کتاب کے مصنف رحمت اللہ طارق نے مکۃ المکرمۃ و دمشق کے لاتعداد کتب خانوں میں علم القرآن، علم الحدیث، اسماء الرجال، تاریخ فقہ اسلامی، لغت، ادب اور نفسیات تمدن کے اتھاہ ذخیروں میں ڈوب کر ایک ایسا تحقیقاتی شاہکار ترتیب دیا ہے جس پر علوم اسلامی اور عصر حاضر کی علمی دنیا بجا طور پر ناز کر سکتی ہے ☆974 سے زائد صفحات ☆669 منسوخ آیات کی تفصیل ☆315 مستقل عنوانات جن کے ذیل میں سینکڑوں علمی مباحث ☆ہزاروں علمی اور مستند کتابوں کے مطالعہ کا نچوڑ روشن کتابت، سفید کاغذ، بڑا سائز

ادارہ ادبیات اسلامیہ ملتان، 1339/3 گلشن آباد، بیرون پاک گیٹ ملتان

صلہ کا معیار
محنت یا سرمایہ؟

آیات النجم 38 تا 40 کا فیصلہ

رحمت اللہ طارق

اللہ کی حاکمیت آسمانوں اور زمینوں کو اپنی وسعتوں میں یوں لئے ہوئے ہے جیسے تکیہ کا غلاف تکیے کو اپنی وسعتوں میں لئے ہوتا ہے اسی طرح الٰہی قوانین بھی کائنات کے ذرے ذرے کو محیط ہوتے ہیں۔ اچھی اور بری سوچ کا اثر معاشرے پر ناگزیر حد تک عکس انداز ہوتا ہے جبکہ خوبصورتی کا راز تعمیری فکر میں زیادہ پنہاں ہے جس سے صدیاں بیت گئیں کہ مسلمان ناآشنا چلے آرہے ہیں تاہم آج بھی ہمارا مشاہدہ ہے کہ جو انسان کسی کا برا نہیں چاہتا اس کی آنکھیں اور چہرہ عام انسانوں سے زیادہ روشن اور پرکشش ہوتے ہیں اور جو لوگ کسی بھی زاویہ سے نوع بشر کا بھلا نہیں چاہتے ان کے ماتھے کے بل — پیشانی کی خوبصورتی کو کم کر دیتے ہیں۔ ہمارے مذہبی اکابر جن کی افتادِ طبع تعصب کے بدبودار کیچڑ کے خمیر سے اٹھتی ہے ان کے چہروں پر تروتازگی نہیں ہوتی۔ پیشانی پر یبوست اور کرختگی چھائی رہتی ہے۔ خوشگواری اور خندہ پیشانی برائے نام بھی نہیں ہوتی۔ وہ مسائل کی نفسیات سے بیگانہ وار جیتے اور انھیں اپنے گروہی سانچے میں ڈھال کر ہر ایک سے امید رکھتے ہیں کہ ان پر شرع مبین کی طرح ایمان لے آئیں حالانکہ زمانہ تغیر پذیر ہے حالات کا دھارا ہمیشہ ایک رخ پر نہیں بہتا۔ ادھر اللہ کے قانون میں نوع بشر کے لئے جو چیز مفید ہوتی ہے وہ اپنی پوری توانائیوں سے نمود پذیر ہوتی ہے اور جس میں وقت کا احترام نہیں ہوتا وہ حرف غلط کی طرح مٹ جاتی ہے۔ قرآن نے اپنی فطری حاکمیت کا اس وقت آغاز کیا تھا جب انسانیت عہد طفولیت کے پنگوڑے میں جھول رہی تھی۔ اس نے معجزہ، کرامت اور کرشمات سے ہٹ کر انسانیت کو سوچ و فکر کی ڈگر پر چلنا سکھلایا کہ اب ماضی کی نبوتوں، وحیوں، معجزات اور اچنبھوں کے نقوش مٹ رہے تھے۔ آئندہ کا

انسان صرف صحیفہ فطرت یعنی قرآن محکم سے راہنمائی حاصل کرنے کا مکلف گردانا گیا تھا۔اب انسانی شکل میں نہ کسی مرسل نے آنا تھا نہ کسی نبی نے رہنمائی کا منصب سنبھالنا تھا اب انسانی قلوب میں قرآن اتارا گیا تھا اب ہر فرد اسی سے راہنمائی حاصل کر کے عقل کی شاہراہ پر چل سکتا تھا۔ خاص کر اللہ کی شریعت بندوں کی مصلحتوں' حاجات اور ضرورتوں کے حسب حال ہوتی ہے جس میں نہ اونچ ہوتی ہے نہ نیچ۔ نہ بڑے کا امتیاز ہوتا ہے نہ چھوٹے کی تفریق۔ یہاں نہ کسی کے تقدس کی خدائی ہوتی ہے نہ کسی عابد کی جبیں سائی۔ اسکے برعکس اللہ کے ازلی حریف ملاں کی شریعت میں سختی ہوتی ہے' انتقام ہوتا ہے' غیظ ہوتا ہے' نفرت ہوتی ہے' غضب ہوتا ہے' رعونت ہوتی ہے' خدائی اختیارات ہوتے ہیں۔ جعلی عبودیت ہوتی ہے اپنی ذہنی اور فکری تراوشوں پر دین کا لیبل چسپاں ہوتا ہے۔ اپنے فقہی فرمودات کو آیات الٰہی پر ترجیح ہوتی ہے' شرع مبین کی شرح میں ایسے ایسے ابلیسی نکتے شامل ہوتے ہیں کہ روح اسلام کانپ اٹھتی ہے۔

تکمیل دین کی نئی تشریح۔

ایک نقیب روایات مجھ سے کہہ رہا تھا کہ روایات ہوں یا فقہی فرمودات ان کے بغیر دین کی تکمیل نہیں ہوتی ان کا انکار دین سے کھلے انحراف کے برابر ہے۔ میں نے بہ ادب گذارش کی کہ دین تو دس ہجری کے ذی الحج کی 9 تاریخ کو عرفات میں مکمل ہو چکا تھا جبکہ روایات اور فقہی فرمودات کا ملغوبہ تو بعد میں تیار ہوا تھا انھیں اگر دین کہا جائے تو خدا کا کہا — غلط ہو جاتا ہے اور رسولؑ کے بعد مذہب کی ہر چیز کو دین کا لبادہ اوڑھا کے تکمیل کے الٰہی فارمولے کو آسانی سے نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ تب نہ وحی کے منقطع ہونے کا تکلف برتنا ہو گا نہ رسالت کے اجراء میں رکاوٹ بننے کی زحمت کرنا ہو گی۔ بلکہ نہ صرف ماضی کے فقہا اور محدثین کے ارشادات کو دین کہنا ہو گا آنے والے ادوار کی مذہبی ترامیم کو بھی خانہ دین میں سجا کر دین ہی

سے موسوم کرنا ہو گا — فرمانے لگے جو کچھ بھی ہو روایات نے بعد میں جنم لیا اور فقہیات بعد میں ایجاد ہوئیں لیکن انھیں دین تسلیم نہ کرنے والا مرتد ہے گردن زدنی ہے۔

نظریاتی اساس سے انحراف

مسلمانوں کی نظریاتی اساس اس فکر پر استوار ہوتی ہے کہ جو لوگ اللہ کی عبدیت اور فطری احکام کی پابندی کرتے ہیں وہ نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر اہل ایمان کا گروہ ہیں اور جو احکام الہیٰ کی اطاعت نہیں کرتے وہ کافر ہیں لیکن مسلمان رفتہ رفتہ اپنے اس اساسی عقیدے سے منحرف ہوتے چلے گئے بلکہ بعد کی ترامیم کو اصل دین کا جز بنانے والے پورے خلوص سے قرآن شکنی کے فارمولوں پر عمل پیرا رہے اور معمولی سے اختلاف پر اشتعال میں آ کر قرآن والوں کی گردنیں مارنے اور غیر مسلم اقلیت بنانے کے فرمان نافذ کرنے پر تلے ہوئے بھی ہیں حالانکہ کہ ایک وقت تھا کہ سرسید علیہ الرحمۃ کے کفر پر عرب و عجم کے فتوے حاصل کر لئے گئے تھے مگر ان ہی احبار میں سے ایک شخص نے دل پر پتھر رکھ کر جب حقیقت حال معلوم کرنا چاہی تو ان پر منکشف ہوا کہ سید ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں یعنی ہوا یوں کہ بانی دیو بند علامہ نانوتوی مرحوم نے سید سے حجیتِ — حدیث کی بابت براہ راست سوال و جواب کا سلسلہ شروع کیا۔ سید والاتبار نے وضاحت کی کہ کوئی بھی حدیث نسبت الی الرسولؐ کے ساتھ ہی واجب الاطاعت بن جاتی ہے اسے حدیث تسلیم نہ کرنا رسول کی نسبت کو "وزن" میں نہ لانے کے برابر ہے جو گستاخی اور سرتابی ہے لیکن ایسی حدیث اگر قرآن اور اسکی پالیسی کے خلاف ہے تو راوی کیسے بھی ثقہ ہوں وہ مسترد ہو گی — چنانچہ نانوتوی صاحب نے سید کی اس معذرت کو — کافی سمجھا اور مزید کریدنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی اور گروہ مکفیرین سے الگ ہو گئے۔ تفصیل ملاحظہ ہو تصفیۃ العقائد طبع دیو بند۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دیو بند کے اکابر کسی زمانے میں "تکفیر" کا شغل رچانے سے پرہیز کرتے تھے مگر بعد میں انھیں ایسی نظر لگ گئی کہ قرآن کا مجرد نام لینے والوں کے ارتداد و تکفیر بلکہ اقلیت بنانے کی قراردادیں پاس کر کے اہل اسلام کو بہ جبر اسلام سے خارج کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں جبکہ نشانہ تکفیر بننے والوں نے نہ کہیں مسجد الگ بنالی ہے نہ ہی سنیوں کی طرح کسی آنے والے کے منتظر ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کو سنیوں سے زیادہ خاتم الرسل مانتے۔ وحی قرآن کو آخری منقطع وحی جانتے اور کسی الگ آئیڈیالوجی کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہ قرآن کے پیروکار فرقہ بندی کے بھی خلاف ہیں۔ جمعات اور عیدین مسلمانوں سے مل کر پڑھتے ہیں امام بریلوی ہو خواہ دیوبندی اور اہلحدیث یہ بغیر جھجک محسوس کئے ان کی امامت میں سجدۂ عبادت بجا لاتے ہیں' رشتے ناطے بغیر کسی مذہبی امتیاز کے ہر ایک سے استوار کرتے ہیں بلکہ جن باتوں مثلاً جن شیاطین' عذاب قبر اور اس طرح کے مسائل میں علمی اختلاف رکھتے بھی ہیں تو یہ اور اس طرح کے اعتقادی مسائل وہی ہیں جن پر تیرہ سو سال سے گفتگو ہوتی رہی ہے بلکہ تمام قدیم اور جدید تفاسیر ایسے اختلافی مواد سے بھری پڑی ہیں اب تعجب تو اس بات پر ہے کہ روشن فکر مسلمانوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ وہ لوگ کر رہے ہیں جن کے دل غیر مسلم ہندوؤں کی خیر سگالی سے تو "معمور" ہیں مگر کلمہ گو مسلمانوں کی جانب سے کینہ اور بغض سے "مملو" ہیں۔ یا للعجب۔

قرآن کی لیبر پالیسی اور ملاں۔

دین اسلام کی ترقی اور قبول عام کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اسلام نے بذریعہ وحیِ قرآن عالم بشریت کو ایک ایسے معاشی نظام سے آشنا کیا جو اس وقت اور آنے والے تمام ادوار کے حسب حال تھا یعنی "صلہ" کا معیار محنت کو ٹھہرایا—— سرمایہ کو نہیں—— حالانکہ یہ بات ملوکیت اور استحصالی دور میں قرآن کے علاوہ کون بتا سکتا تھا؟

چنانچہ معاشی مساوات کے اس فارمولے سے متاثر ہو کر دنیا کشاں کشاں اس نئے نظام کی طرف المدتی چلی آئی مگر برا ہو مُلّا ازم کا جس نے دربار عباسیہ کے زیر اثر پوری توانائیوں سے قرآن اور اسکی انسان نواز پالیسی کو مسترد کرتے ہوئے قرآن کو تسلیم کرنے کا یہ معیار ٹھہرایا کہ

ہر وہ آیت جو اس طریقے کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو "**مؤوّل**" ہے یا "**منسوخ**" ہے۔ (فقہائے احناف کے مسلم پیشوا اور امام — **ابو الحسن عبيد الله الكرخي** (952م) بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی۔ طبع اعظم گڑھ صفحہ 421 سطر 12 تا 13)

بات کیا ہوئی کہ قرآن اگر فقہ حنفی کے اصول و ضوابط سے ہم آہنگ نہیں ہے تو اسکی تاویل کی جائے گی پھر بھی اگر کام نہ چلے تو اسے مسترد کر دیا جائے گا دوسرے لفظوں میں حنفیوں کے نزدیک سپریم لاء قرآن نہیں فقہ حنفی ہے!!

اس طرح فقہا نے ردو قبول کے اپنے معیارات مقرر کر کے ہر موڑ پر نہ صرف قرآن کا راستہ روک دیا حدیث کی بھی پیش نہیں جانے دی — یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے طویل دور حکومت میں قرآن کی مالیاتی پالیسی پروان نہ چڑھ سکی تا آنکہ رواں صدی کی ساٹھ اور ستر کی دہائی میں بعض مسلم ریاستوں نے سوشلزم سے متاثر ہو کر سورہ نجم کی آیات (39، 40) کو نسخ و استرداد کے گرداب سے نکال کر موجودہ معاشی سلوگن — "صلہ کا معیار محنت ہے سرمایہ نہیں" — کے تناظر میں ان آیات کا بنیادی حیثیت سے اعتراف کیا شام میں اخوانی مرشد العام **مصطفىٰ السباعى** مرحوم اور مصر میں **الاستاذ محمد الغزالى** اور اخوانی زعیم **عبدالقادر عوده** نے ان آیات کو اپنی فکری جولانگاہ بنا کر اچھے نتائج سامنے لائے اس طرح قرآن کی یہ خاموش آیات — زبان گویا بنکر ورطۂ نسیاں سے باہر نکل آئیں اور لیبیا کے **معمر القذافى** کے کانوں سے جا ٹکرائیں جبکہ قذافی قرآن کے اس حیرت انگیز انکشاف پر عش عش کر اٹھے اور "**اشتراكية القرآن**" کو مملکت کا ماٹو قرار دے کر لیبیا کو معاشی مساوات کی راہ پر ڈال دیا اب یہ تو طے شدہ ہے کہ قرآن محکم نے غیر صنعتی دور

میں صلے کے معیار کی وضاحت کر کے اس وقت کی محدود سرمایہ کاری اور حال غیر محدود صنعت کاری کے لئے تقسیم نفع کا نہایت منصفانہ فارمولا پیش کر کے اپنی غیر متبدل پالیسی کا لوہا منوایا ہے ارشاد ہے—

ہر عمل کا صلہ ہے اور کسی عامل (محنت کش) کا صلہ ضائع نہیں جاتا۔

(عمران 195)

کیونکہ معیشی (خواہ عربوں کی) اصطلاح میں عمل و محنت کو کہیں بھی سرمایہ کے ——— مفہوم میں استعمال نہیں کیا گیا بنا بریں درست فرمایا کہ:

—اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝

انسان صلہ صرف محنت کا پاتا ہے اور یہ صلہ مل کر ہی رہتا ہے

(نجم 39' 40)

اور یہ دو ٹوک مفہوم ہم نے نہیں تراشا صحابہ رسولؐ' تابعین دیگر قدیم اور حال کے مفکرین نے بھی یہی مفہوم اخذ کیا ہے— یورپ کے جدید معاشیین نے ان آیات کی ہمہ گیر پالیسی کا اعتراف کیا اور قرآن کی "پہل" کو حیرت انگیز ٹھہرایا ہے— علامہ ابن خلدون جس نے تاریخ کو سائنٹفک خطوط پر استوار کیا اور مشاہدے کو راہنما اصول بنایا ہے وہ اپنے دور کے مسلمانوں کی لیبر اصطلاح کو ان الفاظ میں دہراتے ہیں

الكسب هو قيمة الاعمال البشرية— بلاشبہ بنی نوع بشر کی محنت ہی قابل صلہ ہے— **الاعمال هی سبب الكسب**— سعی و عمل ہی صلے کا سبب ہیں— **كثرة الاعمال سبب لكثرة الثروة**— محنت کی فراوانی ہی سے دولت کی فراوانی ممکن ہے— **ان المكاسب انما هو قيم الاعمال**— محنتیں ہی نفع آوری کی بنیاد ہیں— نیز فرمایا **الرزق و الكسب انما هو قيم اعمال اهل العمران**— روزی اور نفع اندوزی ضابطہ عمرانیات کی رو سے محنت کا صلہ اور ثمر ہیں۔

(علامہ طاسین بحوالہ مقدمہ ابن خلدون باب پنجم فصل نمبر1 و نمبر2)

ان فقروں کا ترجمہ میں نے کیا ہے اور مجھ ہی پر ترجمہ کی ذمہ داری عائد ہوتی

ہے اور یہ تمام فقرے — لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی — بے "کشید" کئے گئے ہیں کہ ان آیات میں "حصر" کا لہجہ اختیار فرما کر ان میں اس حقیقت کو منحصر کر دیا گیا ہے کہ صلہ صرف اور صرف محنت کا ہے اس طرح کلمہ حصر — "اِلَّا" نے محنت کو بنیادی حیثیت دے کر صلہ کا معیار صرف محنت ہی کو ٹھیرایا اور دوسرے لفظوں میں سرمایہ کے صلے کی نفی کی ہے — اسکے بعد مزید صیغہ تاکید استعمال فرما کر (سَوْفَ یُرٰی) یقین دلایا ہے کہ محنت کش انسان اپنی محنت کا صلہ ضرور پائے گا (نجم 40) یہی وجہ ہے کہ استاذ محمد الغزالی امام مالک (795م) کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

امام مالک نے ان آیات سے اس حقیقت کو بھانپ لیا ہے کہ صلہ کا معیار محنت ہے لہٰذا — لیقدر اجر العامل بضعف الربح — محنت کش کی اجرت کا کم از کم تعین منافع کے نصف کے برابر کیا جائے۔

(الاسلام المفترىٰ علیہ' طبع قاہرہ 1955م' صفحہ 110)

قرآن کی روشن آیات شبہات کی دلدل میں۔

کچھ لوگ جو دور عباسیہ میں تیار شدہ فقہ کے دلدادہ اور پیروکار اور سرمایہ دار آقایان ولی نعمت کے جاہ و ثروت کو شرعی تحفظات فراہم کرنے کے خوگر ہیں' آیات نجم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ —— ان میں ابراہیم علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں درج احکامات ہیں جن کی پابندی مسلمانوں پر لازم نہیں ہے۔ وغیرہ۔

ایسے حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ اقدار اور "ویلیوز" خواہ کسی بھی دور سے تعلق رکھتی ہوں تمام قوموں اور تمام ادوار میں یکساں قبولیت کا معیار رکھتی ہیں ماسوائے تعزیرات یا حدود کے کہ وہ بسا اوقات اپنے دور کی مصالح اور مناسبتوں کے ماتحت نمود پاتے ہیں۔ اس طرح اگر آیات نجم کے عمومی لہجہ میں کہا گیا ہے کہ — لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی — کوئی کسی کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ یہاں ہر انسان

اپنی ہی محنت اور کئے کا ثمر پالیتا ہے (نجم' 38 تا 40) تو اسکا مطلب یہ نہیں کہ سابقہ امتوں میں تو ایسا ہوتا رہا ہے ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا— کیا ہمارے ہاں ایسا ہوتا ہے کہ قتل پھتّو کرے اور پھانسی کلّو کو دی جائے—؟ تغاری میں اٹھاؤں اور اجرت کسی اور کو مل جائے؟ میرا خیال ہے ایسی منفی سوچ کسی فرزانے کی سوچ نہیں ہو سکتی خاص کر یہ جو نحل میں—مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ—کو بطور مثال سامنے رکھ کر سرمایہ داروں کے تمام کارندے اور ماتحت عملہ جو کہ حقیقت میں—مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ—کے پیکر میں محو سعی و عمل ہیں اور اسکی دولت و ثروت میں اضافہ کرتے ہیں' قرآن ان سب نفع آور انسانوں کو دولت مند کے رزق اور نفع میں برابر کا سہیم و شریک ٹھیراتا ہے—فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ—(نحل 71)— تو اس قرآنی وضاحت کا جواب کیا ہو گا؟ کیونکہ یہ موسیٰ علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں کا بیان نہیں قرآن کے محکمات اپنے الفاظ ہیں—

علامہ رشید رضا کا زاویۂ نظر۔

امام عبدہ کے بڑے شارح علامہ رشید رضا (1935م) اپنے مخصوص زاویۂ سے محنت ہی کو صلے کا معیار ٹھیراتے اور فرماتے ہیں— **وهناك وجه آخر و هو ان الله تعالى جعل طريق تعامل الناس في معا يشهم ان يكون استفاده كل واحد من الآخر بعمل و لم يجعل لاحد منهم حقا على آخر بغير عمل لانه باطل لا مقابل له و بهذه السنة احل الله البيع لان فيه عوضا يقابل عوضا و حرم الربا لانه لا مقابل له.....**

> یہاں سود کے حرام ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معاشی اور لین دین کے معاملات میں استفادے کا یہ اصول مقرر فرمایا ہے کہ ہر انسان اپنے کام اور عمل کے ذریعہ ہی دوسرے سے فائدہ اٹھائے کہ— بغیر کام اور محنت کے کسی سے کچھ لینے کا حق نہیں رہتا بلکہ بغیر محنت کے کچھ

حاصل کرنا حرام ہو جاتا ہے—— تجارت اس لئے حلال ہے کہ اس میں ہر فریق اپنی چیز کا عوض اور بدل رکھتا ہے تاجر اپنی دکان پر بیٹھ کر مال خرید لانے اور بیچنے کی محنت کرتا ہے اسی طرح خریدار اپنی محنت اور کمائی کا بدل (پیسہ) پیش کر کے چیز خرید لیتا ہے—— یہ طریقہ ہے ایک دوسرے سے استفادہ کرنے کا جبکہ ربٰو میں صرف محنت کا بدل نہیں ہوتا اور طرف ثانی صرف پیسے کے زور پر زائد وصول کرنے کا حقدار بن جاتا ہے—— اگر زائد کی بات نہ ہو تو حرام کا چلن بھی نہ ہو۔

(تفسیر "المنار" طبع قاہرہ جلد 108/3)

زر آور صرف محنت ہے

اخوانی لیڈر سید قطب مرحوم اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں—— ولا یلد المال المال انما یلد المال الجهد و الا فهو حرام

مال کو مال پیدا نہیں کرتا محنت ہی مال پیدا کرتی ہے اگر محنت شامل نہ ہو تو وہ حرام بن جاتا ہے۔ (تفسیر "ظلال القرآن" طبع قاہرہ و بیروت جلد 33/3، 34)

نیز فرماتے ہیں——

فالمال لا یربح الا بالجهد و الجهد هو المعول علیه فی الاسلام

مال اس وقت ہی نفع آوری کے قابل ہو جاتا ہے جب تک کہ محنت اس کا سہارا ہے۔ اس طرح اسلام نے نفع کا مدار صرف محنت پر ہی ٹھیرایا ہے—— (حوالہ مذکورہ)

علامہ ڈاکٹر احمد شلبی لکھتے ہیں—— و طریق الحصول علی المال هو العمل

نفع آوری کا دوسرا نام محنت ہے (المجتمع الاسلامی، طبع قاہرہ ص 71)

ناظرین محترم:۔ آیات نجم (39، 40) کو ہمارے اسلاف قیامت سے بھی منسلک کرتے ہیں اور II بنی اسرائیل کے احکام سے بھی نیز یہ کہ III یہ منسوخ ہیں لہٰذا مسلمان سرمایہ دار یا پاکستانی اشرافیہ ان کی زد میں نہیں آسکتی لیکن ہم نے جس زاویہ

سے ان کو پیش کیا ہے اس میں ہم تنہا نہیں ہیں مسلمان مفکرین اور امام مالک ہمارے ساتھ ہیں روح عصر اور امروز و فردا کے تقاضے ہمارے ساتھ ہیں—— سورہ نحل (71) ہمارے ساتھ ہے۔ ایسے میں ہم کیسے باور کریں کہ ان روشن آیات کا ہمارے مسلم معاشرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تاہم یہ تسلیم ہے کہ پاکستان میں راسمالیت کے بڑے نقیب سید ابو الاعلیٰ مودودی اور محترم تقی عثمانی صاحب قرآن محکم کی ایسی توضیحات کو تسلیم نہیں کرتے وہ سرمایہ دارارنہ نظام کی حمایت میں اپنا مختلف زاویہ فکر رکھتے ہیں—— خاص کر ان کے نزدیک قرآن سپریم لاء بھی نہیں ہے لہٰذا وہ محنت کے صلے کے بارے میں ہماری طرح قائل نہیں جبکہ قرآن فرماتا ہے—— کوئی بھی عمل بے صلہ نہیں ہوتا اور اللہ کسی کی محنت کو رائگاں اور بے صلہ نہیں بناتا (عمران' 195) یہاں حیدر بخش جتوئی مرحوم' عبید اللہ سندھی' عبدالرحیم پوپلزئی' سعید احمد اکبر آبادی اور امام الھند ابوالکلام کے ماسوا کم لوگ ہوں گے جو ان آیات کی گہرائی اور گیرائی کا ادراک رکھتے ہوئے صلہ کا معیار محنت کو تسلیم کرتے ہوں گے۔ البتہ کسی ذریعہ سے یورپ والوں کے بند کانوں تک ان آیات کی نحیف آواز ٹکرائی اور انھوں نے کھلے دل سے قبول کر لیا—— اس کے برعکس ہمارے یہاں چونکہ روایات کا چلن اور فقہ کی گرم بازاری ہے لہٰذا قرآن کا مستقبل یقینی حد تک غیر محفوظ ہے—— لہٰذا اس کی معاشی پالیسیوں کی پذیرائی نہیں ہو سکتی—— آپ کو چاہیئے کہ قرآن کے مطالب و مقاصد کو ڈھیرے ڈھیرے لوگوں تک پہنچائیں تاکہ تبلیغ نہ کرنے کے مجرم شمار نہ ہوں—— لیکن اس کے لئے ان قرآنی فکر والوں کی طرح نہ بنیں جو اپنے رسالوں میں قرآن کے لئے کمزور بیساکھیوں کا سہارا لے کر کہتے پھریں کہ——اے میرے بیٹے نواز شریف—— صرف آپ ہی پورے خلوص سے قرآن کا نظام نافذ کرسکتے ہیں ہمت کریں اور ہمیشہ کے لئے نیک نامی حاصل کریں—— جبکہ نواز شریف کے کابینہ کے اہم رکن راجہ ظفرالحق وزیر امور مذہبی 12اکتوبر کو علما سے اپیل کرتے ہیں کہ پرویزیوں کو اقلیت قرار دینے کے لئے ہمارے ساتھ اسمبلی فلور پر تعاون کریں (روزنامہ خبریں ملتان۔ 12اکتوبر 1999ء)

کیا نواز شریف — شیخ علی ہجویری کے مزار پر غلاف نہیں چڑھاتے؟ کیا ضیا الحق کے سالانہ عرس میں شرکت نہیں کرتے؟ کیا محرم اور ربیع الاول کی رسم ادا کرنے سے پرہیز کرتے ہیں؟ کیا انھوں نے کبھی اپنے عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ جسے انسانی حقوق کا ادراک بھی نہیں اس سے قرآنی حقوق کی تکمیل کرائی جائے؟ اے کاش اس طرح کی سوچ دماغوں میں نہ سماتی لیکن ہم اس طرح کی خوش فہمیوں میں صدیوں سے مبتلا چلے آئے ہیں اور اب ہمارے لاشعور میں یہ بات رچی بسی ہوئی ہے کہ قرآن کا نفاذ ملوک و سلاطین اور حکمران ہی کر سکتے ہیں ادھر یہ بھی حقیقت ہے کہ زمانہ ماضی میں شافعی محدثوں اور حنفی مجتہدوں کی بوسنیا اور بغداد سے لے کر اقصائے چین اور دہلی تک ہر فرقہ اپنے مذہب کے فروغ کے لئے ملوک و سلاطین کی دربار سے وابستگی کو سعادت سمجھتا اور شاہی سرپرستی کے لئے دوڑ لگائے ہوئے تھا ادھر اس خیال سے کہ سرپرستی کرنے والوں کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ — سرپرستی ضرور کریں کہ ان کو خدائی اختیارات بھی مل جاتے تھے ظل سبحانی اور مالک رقاب الامم بھی کہلاتے تھے۔ لیکن آج جب کہ سائنسی دور ہے علم و معلومات کی فراوانی ہے خرد افروزی اور روشن خیالی کا دور دورہ ہے — دنیا اپنے علم کے زور پر قرآن کی طرف متوجہ ہو رہی ہے ایسے میں قرآن کے لئے فرماں رواؤں کی سرپرستی طلب کرنا ظلم اور زیادتی ہے۔ قرآن اگر فرماں رواؤں کی ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل میں معاونت کرتا تو یقین ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ ہزار سال میں کسی نہ کسی بادشاہ کی نشاندہی ہو سکتی تھی کہ اس نے فقہ اور حدیث کی پیروی کرنے والوں کی طرح قرآن کی سربلندی کے لئے بھی سوچا تھا۔

والسلام

بسم الله الرحمٰن الرحيم

هذا کتابنا ینطق علیکم بالحق ہماری یہ کتاب تمہیں سچ سچ بتادے گی (جاثیہ،28)

تفسیر برھان القرآن

رحمت اللہ طارق

اس حقیقت کے اظہار میں کہ قرآن کریم کی آیات میں کوئی تضاد یا تناقض نہیں ہے اس میں عربی زبان وادب کے قدیم وجدید علماء اور محققین اور ماہرین لغتِ عربی کی تحقیق وتدقیق کے تناظر میں قرآن محکم کے ان سینکڑوں واضح اور متعین فیصلوں کے تفصیلی تجزیے ہیں جنہیں بعض فقہا اور محدثین نے اپنے خودساختہ عقائد یا تصورات کے خلاف پاکر کالعدم قرار دے دیا تھا۔

قرآن کریم کے محکم ہونے اور تضاد وتناقض نیز شائبۂ تنسیخ سے یکسر پاک ہونے کے بارے میں برہان قاطع اور مطالب قرآنی کی تفہیم اور احکام قرآن کی جوہری تشخیص میں

انسانی جہد وتحقیق کا لازوال شاہکار

بڑا سائز، ایک ہزار سے زائد صفحات قیمت 600 روپے علاوہ ڈاک خرچ

ادارہ ادبیات اسلامیہ 1339/3 گلشن آباد بیرون پاک گیٹ ملتان

لینن سے پہلے

ابنِ حزم

معیشت جدیدہ کے خدوخال

رحمت اللہ طارق

عرب کے ایک شاعر نے کہا تھا کہ اگر جامع الازہر کو بلڈوز کر دیا جائے تو دنیائے عرب میں روشن خیالی پھیل سکتی ہے۔ چنانچہ اس کے کہے کی پذیرائی ہوئی اور گذشتہ صدی میں امام محمد عبدہٗ (1905م) نے اپنے رفقاء کے تعاون سے الازہر کو بلڈوز کر کے دنیائے عرب کو لبرل ازم اور روشن خیالی کی ڈگر پر ڈال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے جہالت کے چراغ ٹمٹمانے بلکہ بے نور ہو کر بجھنے لگے — پہلے جہاں موسم کے مطابق استنجا کے ڈھیلے آگے اور پیچھے لے جانے کے شرعی آداب سکھلائے جاتے اور حیض و نفاس پر تحقیق و ریسرچ کرنے پر ڈگریاں ارزاں ہوتی تھیں اب ہر موضوع اور ہر عنوان پر اظہار خیال کی آزادی میسر آچکی تھی — نازک اور حساس مسائل پر جہاں لب کشائی باعث تعزیر ہوتی تھی اب ان پر کھلے بندوں گفتگو ہونے لگی۔ عصر جدید کا وہ کونسا عقدہ تھا جو کھل نہ سکتا تھا — حل ہوتا چلا گیا لیکن ہند میں جو کچھ ہماری آنکھوں نے دیکھا وہ یہ ہے کہ یہاں کسی بھی ادارے کو بلڈوز نہیں کیا گیا کسی بھی دارالعلوم اور کسی بھی درسگاہ پر کدال کی ضرب لگا کر پیوند زمین نہیں کیا گیا کہ یہاں اور وہاں کے اصلاحی تقاضے اور ظروف مختلف تھے۔ یہاں تنہا سر سید علیہ الرحمۃ (1898م) کی فکری کاوشوں، پختہ عزم اور جہالت کے خلاف مسلح جدوجہد نے تعصب و تنگ نظری کی سیاہ چادروں کو تار تار کر کے ہر طرف نور اور روشنی کی طنابیں کھینچ ڈالیں کہ یہاں صرف علم ہی کی توانائی سے وہ مقاصد حاصل کئے گئے جو ذہنی اکراہ سے نہ ہو سکتے تھے — بایں ہمہ کفر زار ہند میں سر سید کا مشن پوری طرح بار آور نہ ہو سکا اور لوگ یا روحانی اور مذہبی سنگھاسن پر براجمان ہونے والے مقدس افراد روایتی تعصب، تنگ نظری اور نفرت باہمی کا شکار رہے اور یہ کوئی عہد ماضی کی

بات نہیں آج بھی جبکہ سائنس اور علوم جدیدہ کی روشنی ہر سو پھیلی ہوئی ہے ہم تعصب کے گھپ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں— نظریاتی مخالفوں سے بیر ہمارا ملی شعار اور ان کے عقائد کے اختلاف کی آڑ میں انکی گردن ناپنا ہمارا مذہبی وطیرہ بن چکا ہے— اس طرح ہمارے رہنماؤں میں آج بھی نہ رواداری ہے نہ دوسرے کی بات سننے کا یارا۔ حالانکہ طلب اگر سچائی کی ہے اور جستجو اگر بلند مقاصد کی ہے تو ان کا سراغ جہاں سے بھی لگ جائے حیل و حجت کے بغیر قبول کرنا چاہئے— ارشاد باری ہے— **مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْراً کَثِیْراً** (بقرہ' 269) جسکے منظوم ترجمہ میں حکیم الامت علامہ اقبال فرماتے ہیں

گفت حکمت را خدا خیرے کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بہ گیر

یعنی حکمت کی بات جہاں بھی ملے مومن کی فراست اسے تاڑ لیتی ہے اور اس کا فرض بن جاتا ہے کہ زمان و مکان' لہجے اور زبان کے امتیاز کو دیکھے بغیر اپنی گم شدہ متاع سمجھ کر حاصل کر لے۔

سخن کر بہر دیں گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکاں کز بہر حق جوئی چہ جا بلقا چہ جابلسا

انصاف ہی تقویٰ کی اساس ہے۔

قرآن فرماتا ہے— **اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔**

اللہ انصاف کرنے اور عدل کی جستجو رکھنے کا حکم دیتا ہے (نحل' 90)

اور یہ فرما کر عدل کی لمبی چوڑی فہرست یا لگے بندھے ضابطے عنایت نہیں فرمائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں اور جب کہیں انصاف کا سراغ لگ جائے اسے قرآن کی پالیسی اور منشاء سمجھ کر اپنا لینا چاہئے کہ انصاف صرف انسانیت کی ترازو میں تلتا ہے— اب ہمیں معروضی حالات اور نئی مناسبتوں

کی ضو میں نئے امام سامنے لانے ہوں گے اور جب تک کوئی دینی رکاوٹ پیش نہیں آتی انکی رفاقت میں کام کرنا ہو گا۔ اور سابقہ متروکہ جزیات کے بدلے نئی جزیات کو نئے سانچوں میں ڈھالنا ہو گا۔ اب اجتہاد اور وقتی مناسبتیں ہمارے لئے مشعل راہ بنیں گی کہ یہی واحد طریقہ ہے جس سے فرقہ واریت ختم اور فقہی مدارس فکر بلڈوز ہو کر وحدت و یگانگت کی سیدھی شاہراہ پر گامزن ہونے میں یاور اور مددگار ہو سکتے ہیں۔

یہ بات کہ صداقت کا آخری— اور فیصلہ کن معیار کیا ہو گا؟ تو سن لیجئے کہ صداقت کا معیار صرف اور صرف قرآن حکیم اور اس کے بعد عقل سلیم ہے جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ عہد حاضر کے مسائل نے ماضی کے مقابل نئی شکلیں اور وسیع تر پھیلاؤ اختیار کر رکھا ہے لہٰذا انھیں عالمی تناظر میں دیکھنا ہو گا یہاں بات بات میں قرآن کا لفظی حوالہ نہیں دیا جا سکے گا اسکی سپرٹ اور روح کو ملحوظ رکھ کر اور اسکی وسیع تر معنویت کو پرنسپل بنا کر فقہ جدید کی تشکیل کرنا ہو گی۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے چھ خطبات میں ان ہی زاویوں سے الٰہیات کی تشکیل جدید کا اشارہ دیا ہے بلکہ ان سے پہلے سر سیدؒ اور محمد عبدہؒ نے بھی ان ہی سائنٹیفک معیارات کو قبول کرنے کا درس دیا ہے۔ اسلام نے قرآن کی زبانی جو کلیات اور مبادیات عطا کی ہیں وہ زندگی کے ہر موڑ پر ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں تاہم یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم ہر بات میں قرآن کے الفاظ کا سہارا لیں جبکہ اسمیں ہمیں کامیابی کا نہ امکان ہے اور نہ ہی امکان کا امکان بلکہ ہماری اس طرح کی حماقت سے تکلفات اور ناروا تحریفات کے پٹ کھل جائیں گے اور ہم اپنی بات کو بلاوجہ قرآن کے منہ میں ڈال کر گستاخی، جسارت اور بے باکی کے مجرمانہ کردار کے مرتکب ہوں گے—

یہ درست ہے کہ نئی جزئیات کی تلاش اور تقرر ہماری اور وقت کی ضرورت ہے اور ہم اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے مثال کے طور پر قرآن ہمیں حکم دیتا ہے اور اس کا حکم اصولی ہے— کہ خُذُوْا حِذْرَكُمْ— تم اپنی حفاظت میں ہتھیار اٹھا لو (نساء، 71) یا— اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ— اپنے دشمنوں کے خلاف وار کرنے

کے لئے جتنا سامان حرب مہیا کر سکتے ہو کرو (انفال' 60)--- ان ہر دو آیات میں ہتھیار بند ہونے کا حکم دیا ہے لیکن ہتھیاروں کی تفصیل نہیں دی کہ ہر دور کا اسلحہ وقت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتا جس طرح تہذیب و ثقافت میں ارتقاء ہوتا ہے اسی طرح اسلحہ بھی ترقی کے مدارج طے کر کے بہتر سے بہتر دفاع کی صورت مہیا کرتا ہے--- اور آگے بڑھئے تو مفہوم کی وضاحت کے لئے **قصاص** کا فرض حیثیت سے ذکر ہے جبکہ اسکے بنیادی معنے--- ہیں قاتل کا اس وقت تک پیچھا کرنا جب تک مقتول کا حق وصول نہیں ہوتا اور حق وصول کرنے کے اصولی حکم کے ساتھ ہی وضاحت کردی کہ وصولی کی تمام صورتیں اختیاری ہیں یعنے مقتول کے ورثا---(I)۔ چاہیں تو معاف کر دیں--- تو یہ بھی حق وصولی ہی شمار ہوگی--- (II) - نقد رقم کی صورت میں خون بہا وصول کرنا کہ یہ بھی حق وصولی ہی ہے--- (III)- اسی طرح خون کے بدلے خون لینا چاہو تو یہ بھی حق وصولی کی منصفانہ صورت ہے غرضے کہ یہاں جزئیات کہیں باہر سے تلاش نہیں کی گئیں قرآن نے اختیاری لہجہ میں خود ہی واضح کی ہیں تاہم اگر کسی بھی صورت کی جزئیات قرآن میں بیان نہ ہوئی ہوں تو بھی انھیں وحی کے لفظوں میں تلاش نہ کرنا چاہیئے--- خاص کر یہ پالیسیاں مستقل بھی ہوتی ہیں اور اختیاری بھی--- لہٰذا نظر لفظوں پر نہیں ان کی روح اور سپرٹ پر ہونی چاہئے جو صرف انصاف کی متقاضی ہوتی ہیں۔

قرآن سے بہتر کی تلاش

تورات کے بہت سے احکام "حمورابی" (1750 ق م) کے مجموعہ قوانین سے ماخوذ ہیں۔ اور ان ہی میں سزا بالمثل کا حکم بھی ہے یعنی کسی نے اگر کسی کا ہونٹ کاٹ ڈالا ہے تو مقابل میں مجرم کا ہونٹ ہی کاٹ دیا جانا ضروری تھا فرمایا--- **وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ۔**

ہم نے تورات کی الواح میں انھیں سزا بالمثل کا حکم دے رکھا تھا
جس میں تھا کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے
بدلے ناک' کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اسی طرح
زخموں کے بدلے زخم— (مائدہ' 45)

لیکن قرآن نے تورات کی حتمی تعزیرات میں یہ ترمیم کردی کہ جسمانی اور اعضائی سزاؤں کے متبادل جرمانے کا حکم دے دیا جسے قرآن کی اصطلاح میں "دیت" کہا جاتا ہے اور یہ ترمیم دراصل ایک بنیادی نکتہ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے کی گئی ہے کہ قرآن میں سے بھی بہتر کی تلاش کرو— فرمایا—

وَاتَّبِعُوْا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ—

اللہ نے جو احسن چیز نازل کی ہے اس پر عمل پیرا ہو جاؤ—(زمر' 55)

یہاں "احسن" اگر قرآن کی صفت ہے تو قرآن تو سراپا احسن ہے اسکا کوئی حصہ احسن اور کوئی غیر احسن کیسے تصور کیا جا سکتا ہے؟— اشارہ دیا کہ یہ بات نہیں احسن یہاں موزونیت اور مناسبت کا استعارہ ہے جس سے اشارہ ملتا ہے کہ قرآن پاک میں جب کوئی اختیاری پالیسی ہو اور نمٹانے کے کئی زاویے ہوں تو ایسے پہلو دار احکام میں جو حسب حال اور وقت کے لحاظ سے موزوں ہوں انھیں ہی اختیار کرو— حالات جنگی قیدیوں کو تبادلے کے متقاضی ہوں تو تبادلہ ہی کو اختیار کیا جائے اور اگر تبادلے کی صورت نہیں بنتی یعنے فریق دوم کے جنگی قیدی تھوڑے ہیں تو تاوان یا زر فدیہ لینے کی پالیسی کو معمول بنایا جائے— جیسی مصلحت ویسا فیصلہ— کہ موزونیت اور مصلحت کی یہ پالیسی کوئی نئی پالیسی نہیں اقوام سابقہ کو بھی دو طرح کی پالیسیاں دی جاتی رہی ہیں لیکن تعزیرات کے باب میں چونکہ لچک نہیں تھی— یعنے متبادل کا اختیار نہیں تھا لہٰذا اہل تورات نے یہی سمجھا کہ تورات کی ہر پالیسی مستقل اور ناقابل لچک ہے حالانکہ جس طرح اہل قرآن کو خوب سے خوب تر کی تلاش کا اختیار دیا گیا تھا— اہل تورات کے لئے بھی ایسی ہی فطری راہنمائی موجود تھی فرمایا— خُذُوْا بِاَحْسَنِہَا— اے موسیٰؑ اپنی قوم کو بتلا دیجئے کہ وہ مناسبتوں اور موزونیتوں کے ہم

آہنگ حکموں پر عمل پیرا ہوں (اعراف' 145)— لیکن یہودیوں نے خوب تر کو اختیار کرنے کے بجائے تشدد اور سختی کو شیوہ بنالیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو نرم پالیسی پر عمل پیرا ہوئے اور نہ ہی خود پسندیدہ سخت پالیسیوں پر چل سکے (حدید' 27)— کہنے کا مقصد یہ ہے کہ احکام کے نفاذ میں ہمیشہ فیصلوں کی روح اور سپرٹ پر نظر ہونی چاہیئے کہ رسولوں نے اپنے الہامی مجموعوں کے علاوہ بھی باتیں کی ہیں— لہٰذا ہر بات کے لئے وحی کی سند تلاش نہیں کی جا سکتی اگر ایسا ہوتا تو رسولؐ سے یہ نہ کہا جاتا کہ— **شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ**— اے پیغمبر اہل رائے ساتھیوں سے بھی مشورہ کیا کرو (عمران' 159) اور ظاہر ہے کہ پیغمبر جب اللہ کی بات کرتا ہے تو اپنی جانب سے نہیں کرتا وہ تو سراپا وحی ہوتی ہے یعنے کہ عبادات و عقائد' توحید اور معاشرتی یا جنگی حقوق انسانی میں تو پیغمبر خود کفیل ہیں اسے کسی سے مشورے کی ضرورت نہیں ہے لیکن دیگر ہزاروں لاکھوں امور ہیں ان میں نہ خود کفیل ہیں نہ ساتھیوں کے مشورے سے بے نیاز ہیں اس سے معلوم ہو کہ ہر بات میں الفاظ قرآن کا مطالبہ غیر فطری عمل ہے۔

عالمی رسول علاقائی پالیسی نہیں دے سکتا۔

پالیسیاں بلاشبہ بندوں کی فلاح اور بہبود کو ملحوظ رکھ کر ترتیب دی جاتی ہیں اور بندوں کی مصلحتیں زمان و مکان کے اختلاف سے تغیر پذیر ہوتی ہیں لہٰذا کوئی بھی عالمی رسول محدود پالیسی نہیں دیتا— یہاں بطور مثال ایک پالیسی کا ذکر کروں گا مثلاً اسلام سے پہلے جنگی قیدیوں کو فوج میں بانٹ دینے کا رواج تھا اور غلام بننے والے خوشی خوشی غلامی کی ذلت اور اہانت کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیتے تھے لیکن یہ ایک ننگ انسانیت سلسلہ تھا جو لاکھوں برس سے چلا آ رہا تھا جسے قرآن اور عالمی رسول بنظر استحسان نہ دیکھ سکتے تھے فرمایا— **ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ**— بااختیار اور بے اختیار کو دیکھو کہ غلام جو کسی کی جائداد منقولہ کی حیثیت

رکھتا ہے— **لا یقدر** — اور نہایت بے بس ہوتا ہے نہ تو اپنے مالک کے وحشیانہ اختیار کو چیلنج کر سکتا ہے اور نہ ہی امور خیر میں ہاتھ بٹا سکتا ہے (نحل' 75)— اور مساوات شکن یہ عمل اگرچہ مذہبی عقیدہ بن چکا تھا تاہم فاطرازل کو منظور نہ ہو سکتا تھا لہٰذا جب نبوت محمدیہ **علی صاحبہا الصلاۃ و السلام** کا عالمی اور فیصلہ کن دور شروع ہوا تو آئین خداوندی کے آخری پاسبان **سید البشر محمد رسول اللہ** صلی اللہ علیہ و سلم کو حکم ہوا کہ اب جنگی قیدیوں کے بارے میں فرسودہ' وحشیانہ اور ننگ انسانیت پالیسی ختم اور آئندہ کے لئے کسی بھی جنگی قیدی کو غلام نہ بنانے کی پالیسی مستقل رہے گی اور ابدال آباد تک اسی پر عمل رہے گا اب انسانوں کی صورت میں نبوت و رسالت کے دروازے اگرچہ بند کئے جا رہے ہیں تاہم قرآن کی صورت میں اس رسالت کو جاری رکھ کر اور اسے تمام الہامات اور وحی پر **مھیمن** اور نگران بنایا گیا ہے (مائدہ' 48) اب یہ قرآن کا فرض ہے کہ اپنے ماننے والوں کے تعاون سے انسانیت کی گردن اور پاؤں میں پڑے طوق و سلاسل کو توڑ کر پھینک دے (اعراف' 157) اور بطور خاص جنگی قیدیوں کے بارے میں فرمایا— کہ جب تمہاری گرفت میں آ جائیں تو اپنی گرفت کو مضبوط رکھیں — **فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً** — یعنے اب انھیں چھوڑ دینے کی پالیسی تو مستقل اور دائمی ہے لیکن رہائی کا طریقہ اختیاری ہے۔ مسلمان مناسب سمجھیں تو اپنے قیدیوں کے بدلے میں یا — تاوان وصول کر کے رہا کر دیں اور چاہیں بلکہ بہتر ہے کہ انھیں احسان کر کے آزاد کر دیں (محمدؐ' 4) جو صورت حسب حال ہو اختیار کریں— غلام نہ بنائیں— **اللہ اکبر**— محمدؐ اور قرآن یہ پالیسی اس وقت ارزاں فرما رہے ہیں جب انسانیت عہد طفولیت سے نکل کر عہد بلوغت کی طرف ہمک رہی ہے۔

شریعت جب ہماری امنگوں پر پوری نہ اترے۔

کہا جاتا ہے کہ بلاشبہ محمدؐ اور القرآن نے انسانوں کو زندان شریعت سے رہا کر کے

آزادی اور اختیار سے سانس لینے کا چانس دے دیا تھا اور صحابہ رسول نے اسپر عمل بھی کیا لیکن بعد کے ادوار میں عجمی فرماں رواؤں نے پھر سے غلامی کو رواج دینے میں اہم کردار ادا کیا بلکہ حقوق نسواں کے بارے میں شریعت نے بنو پیچیدگیاں پیدا کر ڈالی ہیں اور جنہیں مہذب معاشرہ اور قرآن قبول نہیں کر سکتے۔ یہاں ایسی شریعتوں کی حیثیت کیا ہو گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعتیں یعنی فقہی ضابطے جب بندوں کی مصلحتوں کے احترام سے عاری ہوں تو قابل پذیرائی نہیں ہو سکتے۔ مسلم قانون سازوں نے صاف لکھا ہے کہ شریعت کے تمام احکام سوسائٹی مفاد اور اجتماعی (و عامی) مصلحتوں کی اساس پر مدون ہوتے ہیں یہ مفادات حال سے وابستہ ہوں خواہ مستقبل سے ان کو ہر دور میں یکساں ملحوظ رکھا گیا ہے اور ملحوظ ہی رکھنا پڑے گا— (شاطبی 1388م) کی الموافقات طبع مصر 1341 ہجری جلد 9/2/2 تا 12)— غرناطہ کے امام شاطبی ایک مقام پر خود ہی لکھتے ہیں

> یہ ایک بدیہی امر ہے کہ مصلحتیں عادات و تمدن کے گرد گھومتی ہیں اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شریعت کا بنیادی مقصد سوسائٹی مفاد کے احترام سے وابستہ ہے اور سوسائٹی مفاد کو نظر انداز نہ کرنے کے معنے ہوں گے شریعت میں عادات و تمدن کے تقاضوں کو بنیادی حیثیت سے شامل کرنے کے۔

(الموافقات 2/201/2 تا 5)

بات واضح ہو گئی کہ فقہی احکام اور ضوابط جنہیں شریعت کہا جاتا ہے بندوں کی نفسیات کے منافی ہوں گے تو ان کا احترام نہ ہو سکے گا— امام رشید رضا (1935م) مسلمانوں کی ایک دوسری قانون ساز شخصیت علامہ نجم الدین طوفی (1316م) کے حوالے سے لکھتے ہیں

> اجماع امت اور دلیل واضح ایک طرف ہو اور سوسائٹی مصالح دوسری جانب تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ سوسائٹی مصالح کو ترجیح دیں (بحذف تفصیل)

(بحوالہ یسر الاسلام طبع مصر 1928م' المناد پریس قاہرہ ص 72)
بات واضح ہو گئی کہ شریعت یعنے فقہی ضابطے اگر سوسائٹی مصالح سے عاری اور ہماری امنگوں کے منافی ہیں تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ انھیں جھٹک دیں اور عورتوں اوز غلاموں جیسے مقہور و مظلوم طبقوں کو زندان شریعت سے رہا کر کے محمدؐ اور القرآن کی پالیسی نافذ کریں — نیز اسلام کی معیشی پالیسی کو نافذ کر کے انسانیت کو زرعی اور صنعتی جاگیرداری سے بہ جبر آزاد کریں۔

پالیسیاں مقصود بالذات نہیں ہوتیں ۔

عبادات و عقائد' توحید و ایمانیات سے ہٹ کر جاری پالیسیاں مستقل ہوں یا عارضی اور اختیاری' وہ مقصود بالذات نہیں ہوتیں حصول مقصد کا ذریعہ ہوتی ہیں جب مقصد حاصل ہو گیا — پالیسی کا منشاء پورا ہو گیا — اسی طرح حدود و تعزیرات بھی مقصود بالذات نہیں ہوتیں — حصول مقصد کا زینہ ہوتی ہیں یعنے جرائم پر قدغن عائد کرنے کا ذریعہ — لیکن اگر دنیا کے کسی بھی دوسرے ذریعہ سے جرائم کو منصۂ شہود سے غائب کیا جا سکتا ہے تو یوں سمجھو اسلام کا منشاء پورا ہو گیا بشرطیکہ آپ یہ نہ سوچیں کہ اگر جرائم کا وجود نابود ہو گیا تو اسلامی حدود و تعزیرات بیکار یا منسوخ ہو جائیں گی کیونکہ یہ سوچ منفی ہو گی۔ اسی طرح اگر آپ غربت و افلاس کو اس بناء پر رہنے دیتے ہیں کہ ان کے فقدان سے زکوٰۃ' انفاق اور "العفو" کے ضابطے معطل و بیکار ہو جائیں گے تو یہ قرآن سے آپ انصاف نہیں کر پائے — آپ کی یہ سوچ ہزار سال سے دماغ میں رچی بسی ہوئی ہے — جس سے ہم نہ صرف ترقی اور انسانیت کی بلند سطح تک پہنچنے سے محروم چلے آ رہے ہیں — آیندہ بھی کوئی بہتری کی صورت نظر نہیں آ رہی۔

ان اصولی وضاحتوں کے بعد آیئے اب معیشت جدیدہ کے لئے جو نئی تجاویز و اصطلاحات سامنے آئی ہیں دیکھیں کہ ان میں کون کون سی تجاویز ہمارے حسب حال

ہیں خاص کر اس زاویہ سے کہ کیا گذشتہ 14 سو سال میں کوئی بھی ایسا مرد جری گذرا ہے جس نے معاشیات قرآن کو عالمی تناظر میں پیش کر کے قرآن کی بالادستی اور نگران حیثیت کا ڈنکا بجادیا ہے اگر تو اس کا سراغ ملتا ہے تو ہمارا مقصد ماجس وجوہ پورا ہو گیا کہ ہم میں سے بھی ایسے انقلابی انسان گذرے ہیں جو معیشت کے فرسودہ طریقوں پر نفریں کرتے رہے ہیں وہ انسانوں کو اللہ کی ملک سمجھتے تھے اور ذرائع پیداوار کو اللہ اور اسکی مخلوق کی ملکیت۔

لینن سے پہلے ابن حزم۔

جہاں تک مسلمانوں کے معاشی نظام کا تعلق ہے ہمارے اسلاف نے اس ضمن میں ہمارے دامن کو ان جواہرپاروں سے مالا مال کر رکھا ہے جو لینن اور مارکس کے نگار خانوں میں عنقا تھے۔ ان حضرات نے جس حقیقت سے حال ہی میں نقاب کشائی کی ہے ہمارے اسلاف نے ساڑھے آٹھ سو سال پہلے پوری تفصیل سے اس کے تمام گوشے واضح کر دیئے ہیں یہ — پدرم سلطان بود— کی بیہودہ بڑ نہیں ہے' سند اور حجت کے ہمراہ وہ دعوٰے ہے جس کو جھٹلانا کسی کے بس کا روگ نہیں ہے— اسلامی تاریخ نے ایک ایسی عہد آفرین شخصیت کو محفوظ کر رکھا ہے جس کا نام زبان پر آتے ہی لینن اور مارکس لوح قلب سے محو ہو جاتے ہیں— میرا اشارہ اسلام کی عظیم شخصیت **امام ابو محمد علی ابن حزم اندلسی** (1064م) کی طرف ہے جسے دنیا ابن حزم ظاہری کے نام سے یاد کرتی ہے۔ آپ نے چار سو کے قریب تصانیف کا مبسوط اور ضخیم ذخیرہ چھوڑا ہے' مجتہد مطلق تھے' فقیہ تھے دانشور اور ادیب تھے' سخن شناس اور خطیب تھے اور ان خوبیوں پر مستزاد کہ معاشیات میں صرف وحی قرآن سے استدلال فرماتے تھے— ان کی فقہی انسائیکلو پیڈیا **"المحلّٰی"** کے نام سے گیارہ ضخیم جلدوں چار ہزار تین سو نوے صفحات پر مشتمل میرے سامنے ہے— اس کی چھٹی جلد میں جہاں بٹائی اور دیگر وسائل آبادکاری کو حرام قرار دیا گیا ہے وہاں معاشیات کے باب میں "اجتماعیت" کے مفاد کی ترجمانی بھی کی ہے۔

بنیادی ضرورتوں کا ذمہ دار کون؟

کسی بھی معاشرے اور حکومت میں سب سے پہلے یہ سوال ضرور اٹھے گا کہ افراد کی بنیادی ضرورتیں کیا ہیں؟ اور ان کی تکمیل کا ذمہ دار کون ہے؟ اس ضمن میں امام ابن حزم رقمطراز ہیں۔

روٹی — **بما یاکلون من القوت الذی لا بدمنه**

ایسی غذا جو مملکت کے عام افراد کی زندگی و ضروریات غذائی کی ضمانت فراہم کرے۔

(المحلی — طبع منیر دمشقی۔ قاہرہ جلد 13/156/6)

کپڑا — **و من اللباس للشتاء و الصیف مثل ذالک**

غذا کی طرح ایسا لباس جو گرمی و سردی میں انسانی صحت کو تحفظ فراہم کرے۔

(المحلی — جلد 12/156/6 تا 16)

اور مکان — **و بمسکن یکنهم من المطر والشمس و عیون الماره**

اور ایسا مکان جو بارش، ہوا کے سرد و گرم جھونکوں اور محل وقوع کے لحاظ سے راہ گیروں کی نظروں سے یکسو ہو۔

(المحلی 14/156/6 تا 15)

ان ضروریات کی تکمیل کے لئے ابن حزم سرمایہ داروں اور مملکت کے بااختیار افراد کو یکساں ذمہ دار ٹھہراتے اور فرماتے ہیں کہ — **و اما القیام بالمجهود ففرض و دین و لیس بصدقة۔**

اس قومی ذمہ داری کی تکمیل مالدار لوگوں پر عائد ہوتی ہے وہ اسے رضاکارانہ طور پر نہیں فرض حیثیت سے پورا کریں یا یہ سمجھ کر کہ انہوں نے عام افراد کا قرض

چکانا ہے وہ قرض کی حیثیت سے حق ادائیگی کریں۔ (المحلی 156/6)

لیکن اگر سرمایہ دار اس معاملہ میں کوتاہی یا بے حسی کا مظاہرہ کریں تو ـــــ **و یجبرھم السلطان علی ذالک** ـــ حکومت کا فرض بنتا ہے کہ جبری قانون کے ذریعہ دولت مندوں سے چھین کر افراد کی ضروریات کو پورا کرے۔

(المحلی 16/156/6)

یہاں ابن حزم کا استدلال یہ ہے کہ ضروریات کی مذکورہ اصناف کا تعلق زمینی پیداوار اور زمینی مخلوق سے ہے فرمایا ـــ

ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ـــ

اللہ وہی ہے جس نے زمین اور اس کی ہر پیداوار کو تم سب کی مشترکہ میراث قرار دیا ہے ـــ (بقرہ' 29)

اور جو چیز سب کی مشترکہ میراث ہو اس پر غاصبانہ قبضہ جمانا قانون اور اخلاق کی نظروں میں جرم ہے ـــ وہ لٹیرا ہے اور لٹیروں سے لوٹا ہوا مال بر آمد کرنا ہر حکومت کا فرض ہے بشرطیکہ حکومت خود ہی لٹیروں کی نہ ہو۔

تنہا سرمایہ دار ہی دولت کا مالک نہیں بن سکتا ۔

ابن حزم روٹی' کپڑے' لباس و تعلیم' صحت و دیگر ضروریات کی تکمیل کے موقف میں ذیل کی آیات سے استدلال فرماتے ہیں ـــ

وَ اٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَ الْمِسْکِیْنَ (اسراء' 26) ـــ **وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ وَ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ** (نساء' 36)

امام ابن حزم کے بموجب پہلی آیت میں "حَقَّہٗ" کا لفظ فیصلہ کن حیثیت سے واضح کرتا ہے کہ رشتہ داروں' ضرورت مندوں' مسافروں' ہمسایوں' اجنبی ہمسایوں' پاس بیٹھنے والوں' پردیسیوں' اور ان ماتحت لوگوں کا جو اپنی محنت اور توانائی سے تمہارے مال و دولت میں اضافہ کرتے ہیں یہ سب احسان کے مستحق بھی ہیں اور

تمہارے دھن و دولت میں حقدار بھی — وَفِیْٓ اَمْوَالِہِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ
(الذاریات' 19)

اور حق —— ابن حزم کے فلسفہ کے مطابق مانگنے سے نہیں ملتا چھینا جاتا ہے وضاحت آگے آ رہی ہے۔

ذخیرہ اندوز اور دولت سے تجوریاں بھرنے والا جہنمی ہے۔

ابن حزم نے دولت سے تجوریاں بھرنے اور غلہ کا سٹاک کرنے والے کو سورہ مدثر کی 44 ویں آیت سے استدلال کرتے ہوئے جہنمی قرار دیا ہے (المحلیٰ — 13/156/6 تا 14) اور جہنمی انکی معیشی اصطلاح میں نہایت سنگین سزا کا مستوجب ہے وہ اس کے انجام بد کے بارے میں لکھتے ہیں — فان جاعوا — او عروا و جهدوا فيمنع الاغنياء و حق الله تعالى ان يحاسبهم يوم القيمه و يعذبهم عليه

> مملکت کا نادار طبقہ ذخیرہ اندوزوں کے مال غائب کرنے یا روک دینے کے باعث اگر بھوک ' ننگ اور موت کا شکار ہو جاتا ہے تو اللہ سبحانہ کا حق بنتا ہے کہ ایسے ناہنجاروں کو سنگین عذاب سے دو چار کرے۔

(المحلی 11/156/6 تا 14)

ذخیرہ اندوز انسانیت کا دشمن ہے۔

و عن رسول الله من طرق كثيرة فى غاية الصحة انه قال من لا يرحم الناس لا يرحم الله قال ابو محمد و من كان على، فضل ورأى المسلم اخاه جائعا عريانا ضائعا فلم يغثه فما رحمه بلا شك ـ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت پختہ ذرائع سے ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا — "جو شخص انسان دشمن و بے رحم ہے' اللہ کی نظر میں ناقابل رحم ہے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہماری اس رائے کا موید ہے کہ جو دولت مند ـــــ کسی مسلمان کو دانستہ بھوک، ننگ اور موت سے دوچار کر دیتا ہے، وہ بے رحم اور سفاک ہے (المحلیٰ ـــ 6/157/2تا6)

اس حدیث سے اشارہ ملتا ہے کہ بے رحم دولت مند جب کسی ناگہانی آفت میں مبتلا ہو یا آگ میں جل رہا ـــــ پانی میں ڈوب رہا ـــــ یا دیوار کے نیچے دب گیا ہو اور آخری سانسوں پہ ہو تو اسے مرنے دیا جائے، اسے بچانا ظلم کو تحفظ دینے کے مترادف ہے۔

دولت کا پجاری زہریلا سانپ ہے:

قال ابو محمد من ترکه یجوع و یعری و هو قادر علی اطعامه و کسوته فقد اسلمه،

جو یہ دیکھ رہا ہے کہ ایک شخص غریبی کے ہاتھوں تن پر کپڑا نہیں رکھتا ـــــ بھوک کی شدت سے جاں بلب ہے اور وہ اس پر قادر ہے کہ لباس اور خوراک بہم پہنچائے مگر وہ گریز کرتا ہے تو وہ ایسا شقی القلب، بے رحم اور ظالم سانپ ہے جس نے دانستہ اس کو ڈس دیا (المحلیٰ ـــــ 6 / 157 / 19 تا 20)

ابن حزم کا مقصد یہ ہے کہ ایسے زہریلے کوبرے کا سر کچل کر ضرورت مندوں کو اس کے ضرر سے بچایا جائے۔

ضرورت سے زیادہ مال کسی کی ملکیت نہیں رہتا:

ان رسول الله صلی الله علیه و سلم قال من کان له فضل ظهر فلیعد به علی من لا ظهرله و من کان له فضل من زاد فلیعد به علی من لا زادله۔ قال فذکر من اصناف المال ما ذکر حتی رأینا انه لا حق لا حد منا فی فضل۔

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ سواری ہو، وہ زائد کو

اسے دے ڈالے جس کے پاس سواری نہیں ہے۔ اور جس کے پاس اپنی احتیاج سے زیادہ خوراک ہو وہ زائد کو ان کے سپرد کر دے جو خوراک میں خود کفیل نہیں ہیں۔ (ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ) اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دولت کی تمام اقسام اور اصناف کی تفصیل بتا دی جسے سن کر ہم نے یقین کر لیا کہ زائد مال پر ہمارا حق تصرف رہتا ہی نہیں۔ (المحلی — 6 /157)

تبصرہ: اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لاثانی ابن حزم لکھتے ہیں **وھذا اجتماع الصحابة یخبرھم بذالک ابو سعید و بکل ما فی ھذالخبر نقول**

ابو سعید نے اس روایت کو جب صحابہ کرام کے سامنے بیان کیا تو — **وایتا** — کا لفظ استعمال کیا جو تمام صحابہ کے اجماع کا غماز ہے۔ یعنی روایت کے علاوہ صحابہ کا اجماع بھی یہی ہے کہ زائد از ضرورت کوئی مال ہو قابض کی ملکیت سے نکل جاتا ہے اور میں (ابن حزم) حدیث کے وسیع تر مفہوم اور صحابہ کے تائیدی اجماع پر کامل ایمان رکھتا اور علماء کے موقف کو جامع صورت دیتا ہوں۔

(المحلی — 6/157/3 تا 4

ابن حزم کا مقصد یہ ہے کہ قابض ضروری نہیں کہ مالک ہی تصور کر لیا جائے — امین اور خزانچی بھی کہلا سکتا ہے — ارشاد ہے — "جنھوں نے اپنی ذہنی صلاحیتوں سے رزق کے سرچشموں تک رسائی حاصل کر لی ہے وہ یہ نہ سمجھیں کہ دوسروں کو ان تک رسائی سے روکنے کے مجاز ہیں — نہیں اور ہرگز نہیں — وہ اور اس کی آمدنی میں اضافہ کرنے والے مساوی حق رکھتے ہیں — **فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ** — (نحل' 71)

فاضل دولت چھیننے کے فاروقی عزائم: **قال عمرؓ بن الخطاب لواستقبلت**

من امری ما استدبرت لا خذت فضول اموال الاغنیا فقسمتھا علی فقراء المھاجرین و ھذا اسناد فی غایۃ الصحۃ والجلالۃ

(عمرؓ نے کہا) کہ مجھے پہلے ہی سے اس امر کا اگر اندازہ ہوتا جو بعد کو ہوا تو میں سب سے پہلے سرمایہ داروں کی زائد دولت چھین کر (لاخذت) مہاجرین میں سے جو نادار ہیں' ان میں تقسیم کر دیتا ۔

(المحلیٰ 6/158/7 تا 10)

ابن حزم اس فرمان کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ صحت اور عظمت کے لحاظ سے بہت ہی اعلیٰ سند سے مروی ہے بلکہ اس میں ایک بلیغ اشارہ ہے کہ نہ صرف مشکل وقت ہی میں دولت مندوں کا سرمایہ چھین لینا ہی ناگزیر ہے —— یہ کام ایسی مشکل کے پیش آنے سے پہلے ہی ہونا چاہئے یعنی یہ ہنگامی نہیں دائمی اور مستقل قدر ہے۔ یہ حکم نہ صرف مہاجروں کو مالی کمک پہنچا کر لوکل کے مقابل توانا بنانا ہے —— اسراء (26) اور نساء (36) کی رو سے ناداروں کی تمام اقسام کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا مقصود ہے۔ اس میں وہ مہاجر بھی شامل ہیں جو ناداری میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں (نہ کہ ہر مہاجر)

اس فرمان کا ماخذ: پیغمبرؐ کے فرامین اور صحابہؓ کے اجماعی فیصلوں سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے معاشی نظام کو جن بنیادوں پر استوار کیا ہے' وہ فطرت انسانی کے عین مطابق اور موجودہ سوشلزم سے صدیاں پہلے عوام کی جانی بوجھی بنیادیں تھیں یعنی مسلمانوں کے لئے فاضل دولت کا بہ جبر حاصل کر کے مفاد عامہ کے لئے خاص کرنا کوئی نیا نظام نہیں تھا —— وہ جانتے تھے کہ —— سرمایہ داری' ذخیرہ اندوزی اور اکتناز زر کی آنحضرتؐ نے کیا حیثیت واضح کی ہے —— **وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ....**

جو لوگ سونے اور چاندی کو سنبھال سنبھال کر رکھتے اور قانون خدا کے مطابق کھلا نہیں رکھتے' انہیں دردناک اذیت کی وارننگ

دیکھئے' وہ اذیت جو انقلاب کے دن ان کو ملے گی—— اس کی صورت یہ ہوگی کہ سونے اور چاندی کو گرم کر کے ان کی پیشانیوں' پہلو اور پیٹھوں کو داغ کر انہیں کہا جائے گا کہ لو یہ ہے اس چاندی اور سونے کا مصرف جسے تم چھپا چھپا کر رکھتے تھے۔ (توبہ، 34)

اس آیت میں جس عذاب کا ذکر ہے' کچھ ضروری نہیں کہ اسے روز قیامت ہی سے مربوط کیا جائے کیوں کہ اذیت برائے عبرت ہوتی ہے جس کا بدیہی تعلق ہماری اسی دنیا سے ہوتا ہے —— اور پیشانی وغیرہ داغنا اذیت کی سنگینی کو مبالغہ کی حد تک واضح کرتا ہے یعنی ذخیرہ اندوز کی طرح سونے اور چاندی کو مفاد عامہ سے روک رکھنے کی اسی دنیا میں سنگین سے سنگین سزا بھی ہو سکتی ہے۔

زکوٰۃ جب کافی نہ ہو: زکوٰۃ ریاست کے معاشی نظام کا بنیادی ستون ہے—— اس کی نادہندگی سے ملک کا استحکام خطرے میں پڑ جاتا ہے—— یہ اگر خزانے میں جمع نہ ہو تو نہ صرف بنیادی ضروریات کی تکمیل مشکل بن جاتی ہے' ملک کا دفاع بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا اسے دیگر محاصل کی طرح مسلسل جاری رہنا چاہئے بلکہ حالات اگر برہم ہوں اور زکوٰۃ کا محصل کافی نہ ہوتا ہو تو حکومت کا فرض بنتا ہے کہ جمع زر کا جو طریقہ بھی مناسب سمجھے' اختیار کر لے —— ابن حزم لکھتے ہیں ان لم

تقوموا الزکواۃ بہم و لافی سائر المسلمین بہم

زائد محصول (ٹیکس) لگانا حکومت پر اس وقت فرض ہو جاتا ہے جب زکوٰۃ کی رقم اور "فئی" کی آمدنی کافی نہ ہو (المحلی—— 158/6)

"فئی" سے ان زمینوں کی آمدنی مراد ہے جنہیں حکومت اپنی نگرانی میں لے کر بیت المال میں جمع کرتی ہے۔

یہ تمام حوالہ جات واضح کرتے ہیں کہ حکومت اگر وحی قرآن کی اساس پر قائم ہے تو اسے ایمرجنسی حالات میں بھاری املاک اپنے قبضہ میں لینے کی اجازت ہے اور

اجازت ہے کہ

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

یہ نہ گھیراؤ ہے نہ جلاؤ ہے' حق چھیننے کا الہامی طریقہ ہے۔

خشک سالی میں راشن سسٹم: ابن حزم اپنے اشتراکی نظریئے کے اثبات میں ذیل کے تاریخی واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وصح عن ابی عبیدہ بن الجراح و ثلثمأۃ من الصحابۃ ان زادھم فنی فامرھم ابوعبیدہ فجمعوا ازوادھم فی مزودین و جعل یقوتھم اباھا علی السواء فھٰذا اجماع مقطوع بہ من الصحابۃ لا مخالفلھم منھم

مشہور فاتح حضرت ابو عبیدہ بن جراح (639م) اور تین سو جلیل القدر صحابہ رسول ؐ سے باوثوق ذرائع سے روایت ہے کہ ایک سال انہیں غلے کی کمیابی کا سامنا کرنا پڑا جس پر ابو عبیدہ ؓ نے حکم دیا کہ جتنا کچھ کسی کے پاس غلہ ہے' اسے حکومت کے دو بڑے توشہ دانوں (غلہ سٹاک کرنے کے مرکزوں) میں جمع کر دے ۔۔۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ ان توشہ دانوں میں سے ہر ایک فرد کو مساوی خوراک مہیا کی جاتی رہی۔

اس واقعہ کو نقل کر دینے کے بعد ہمارے ابن حزم لکھتے ہیں۔

یہ صحابہ کا ایسا قطعی اجماع ہے جس کی مخالفت میں کسی بھی فرد کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی ۔۔۔ (المحلی 6/158/18 تا 20)

حتیٰ کہ اشعریوں کے عقیدے کے مطابق کسی نے یہ تک نہیں کہا کہ ۔۔۔ جب اللہ سبحانہ خود ہی کسی کو کم اور کسی کو زیادہ رزق دیتے ہیں تو ابوعبیدہ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ سب کو ایک سی روزی فراہم کریں؟

ذخیرہ اندوزوں اور سرمایہ کے سانپوں کا سر کچلنا کیسا ہے؟: امام ابن حزم سرمایہ داروں کی ذہنی خباثتوں سے آگاہ اور ان کے عوام دشمن وطیرے سے پوری طرح واقف تھے۔ اس ضمن میں جو کچھ انہوں نے قلم بند فرمایا ہے' مشاہدہ اور تنہا روایت پر ہی اس کا مدار نہیں ہے۔ فراست اور عقل سے بھی اپنے مدعا کو ثابت کیا ہے۔ آپ کی ژرف نگہی ملاحظہ ہو معانی و مطالب کے کیا موتی رولے ہیں؟ فرماتے ہیں کہ **یقولون من عطش فخاف الموت ففرض علیه ان یاخذ الماء حیث وجده و ان یقاتل علیه**

فقیہ حضرات کہتے ہیں کہ پیاس کی وجہ سے موت یقینی ہو اور پیاسے میں ابھی لڑنے بھڑنے کی سکت ہے تو جس طرح چاہے پانی حاصل کر لے خواہ اس کے لئے قتل تک ہی نوبت کیوں نہ پہنچے۔

(المحلی 6/159/12 تا 13)

یعنی یہ لوگ پانی کے لئے تو لڑنے بھڑنے کو روا رکھتے ہیں لیکن

فای فرق بین ما اباحوا له من القتال علی ما یدفع به عن نفسه الموت من العطش و بین ما منعوه من القتال عن نفسه فیما یدفع عنه الموت من الجوع و العری؟ و هذا خلاف للاجماع و القران و السنن والقیاس ۔

(المحلی 6/159/14 تا 16)

یہی فقہا پیاس اور بھوک میں فرق کرتے ہوئے پیاس کے لئے تو مرنے مارنے کی اجازت دے دیتے ہیں اور بھوک سے مرجانے پر اجازت نہیں دیتے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ پیاس ہو' بھوک ہو اور ننگ ہو ـــــ ان سب کا مداوا کرنے کے لئے رکاوٹ ڈالنے والے پر جھپٹنا' مارنا اور واصل جہنم کرنا بحکم قرآن' بحکم اجماع صحابہ' بحکم سنت نبویہ اور بہ تقاضائے قیاس روا' جائز اور واجب ہے ـــــ

ذخیرہ اندوز کو مار ڈالنے پر قصاص نہیں ہے: فقہا نے غالباً اس خیال سے کہ پانی اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، جس کے حصول کے لئے "تشدد" جائز ہے اور غذا نجی پس انداز ہے جسے تشدد کے ذریعہ حاصل کرنا روا نہیں ہے، لیکن وہ قرآن کا جواب کیا دیں گے کہ **ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا** —— زمین اور اس کی ہر پیداوار کو اللہ نے تم سب کے لئے برابر پیدا کیا ہے لہٰذا اس پر یک طرفہ قبضہ جمانا قانون خداوندی کی رو سے بغاوت ہے اور باغی سے دو دو ہاتھ کرنا ہر فرد کی ذمہ داری ہے —— امام ابن حزم کے سامنے یہی نکتہ تھا —— وہ خود بھی بڑے فقیہ، مجتہد مطلق اور اپنی اسناد کے ساتھ روایت کرنے والے محدث تھے —— وہ فقہا کی مذکورہ تاویل کو نہیں مانتے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اضطراری حالت میں خنزیر اور مردار کو غذا کے بطور وحی قرآن نے اس حالت میں اجازت دی ہے جب کسی شخص کے پاس مضطر کی حاجت روائی کرنے کا انتظام نہ ہو لیکن اگر کسی کے پاس سب کچھ ہے اور وہ اپنے ہم جنس کو مرتا دیکھ کر اس کی زندگی بچانے سے گریز کرتا ہے تو وہ باغی ہے **ولہ ان یقاتل علی ذالک فان قتل فعلی قاتلہ القود وان قتل المانع فالی لعنۃ اللہ لانہ منع حقا وھو من طائفۃ باغیۃ**

اور ایسے مضطر انسانوں کو اجازت ہے کہ ذخیرہ اندوز سرمایہ دار سے دست و گریبان ہو جائیں۔ اس صورت میں اگر مضطر کی موت واقع ہو جاتی ہے تو صاحب مال سے قصاص لیا جائے گا اور اگر صاحب مال ہی مارا جاتا ہے تو وہ اللہ کی لعنت کا سزاوار ہو گیا اور اس کا نہ قصاص ہے نہ خون بہا کیوں کہ وہ اللہ کے قانون توڑ کر اہل بغاوت میں شامل ہو گیا۔

اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ **فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰھُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ**

ایک فریق جب دوسرے پر زیادتی کرے اور اس کا حق مارے تو صلح کرانے والوں اور زیادتی کا شکار ہونے والے کا حق بنتا ہے کہ زیادتی کرنے والے کو جہنم واصل کر دے۔ (حجرات، 9) (المحلی 20/159/6 تا 22)

امام ابن حزم مضطر کو یہاں تک لڑنے کا حق دیتے ہیں کہ اگر وہ ذخیرہ اندوز صاحب مال پر جھپٹنے میں پہل کرے تو بھی زیادتی اور بغاوت کرنے والا صاحب مال ہی پہل کرنے والا متصور ہو گا کہ حق مارنے میں پہل اسی نے ہی کی تھی ـــ و مانع الحق باغ علی اخیه الذی له الحق و بهذا قاتل ابوبکرؓ مانع الذکوه و بالله تعالیٰ التوفیق ـ

> جس نے اپنے ہم جنس بھائی کا حق مارا' وہی باغی متصور ہو گا اور اسی ہی نکتہ کو ملحوظ رکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے زکوٰۃ کا حق دبانے والوں کو اہل بغاوت میں شمار کر کے ان سے جنگ لڑی(المحلی 6/159/ 24 تا 25)

یہ تھے چند وہ اقتباسات جو اسلامی اشتراکیت کے سب سے بڑے علم بردار امام ابن حزم (1064م) نے جدید معاشی مفکرین کارل مارکس (1883م) اور لینن (1924ء) سے کئی سو سال پہلے تحریر فرمائے ـــ یہ صحیح ہے کہ آپ نے جس معاشی نظام کی نشاندہی فرمائی' اس کے لئے کوئی اصطلاحی نام تجویز نہیں فرمایا لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سرمایہ داری اور اشتمالیت پر اس سے زیادہ وضاحت سے عصر حاضر کے خداوندان اشتراکیت بھی نہیں بتلا سکے ـــ کیوں کہ ان کی نظر قرآن پر نہیں تھی ـــ قرآن سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا لیکن ابن حزم نے اپنی فکر میں روح قرآن کو سمویا اور پھر قرآن ہی کی روح اور سپرٹ میں ڈوب کر لکھا اور خوب لکھا۔

وضع الموازين القسط
تفسیر
میزان القرآن
یعنی
تحریر
رحمت اللہ طارق

اسلام میں

اجتماعیت

کا تصور

رحمت اللہ طارق

وہ جنکے دلوں میں ملک وقوم سے محبت ہے
انہیں چونکا دینے والی ایک زندہ تحریر

رحمت اللہ طارق

آج کل نج کاری کو افلاس و غربت کو دور کرنے کے لئے نسخہ شفا بتلایا جا رہا ہے جس سے ایک بار پھر سے نظام جاگیرداری کے پلٹ آنے کا راستہ ہموار ہونا شروع ہو گیا ہے ادھر مشاہدہ گواہ ہے کہ جاگیرداری نظام زرعی ہو خواہ صنعتی حیات بشر کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں مالک و مزدور کا تعلق عابد و معبود کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور بہ ظاہر انسانوں کی فروخت کی منڈیاں اگرچہ نہیں لگتیں مگر نتیجہ کے لحاظ سے بدترین غلامی کو فروغ ملتا ہے اسلام نے اگرچہ اپنے تئیں سال کے مختصر عرصے میں دنیا کو جس نظام سے روشناس کرایا تھا اس میں زمینی خداؤں کا تصور نابود کر دیا گیا تھا تاہم طاقتور لوگوں کو محروموں پر حکومت کرنے کا جو "چسکہ" پڑ چکا تھا وہ اپنی خفیہ اور اعلانیہ مکاری سے پھر سے مالک رقاب الامم (انسانی گردنوں کے مالک) بنتے چلے گئے لہذا اب کی بار یہ خدائی ثقافتی رنگ و روپ میں سامنے آ گئی کہ ملوکیت پرست ملا نے اسکے لئے مالک رقاب الامم کا لقب خاص کر رکھا تھا ادھر ملا ہی کے کہنے پر محکوم مقتدیوں نے غلامی کو نئے عنوان سے اپنے ماتھے کا جھومر بنانے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا چنانچہ حادثہ شکاگو تک یہ نظام کامیابی سے چلتا رہا اس کے بعد نئے معاشی مفکر پیدا ہوئے جو اجتماعیت کے سلسلہ کو متعارف کرانے لگے اب اسلام ان کی بہتر رہنمائی کر سکتا مگر اسکا تو اس کے ماننے والوں نے چہرہ ہی مسخ کیا ہوا تھا وہ تو اپنوں کے کردار کے تناظر میں دہشت گردی اور شخصیت پرستی کا روپ دھار چکا تھا اس میں سکت اور صلاحیت کہاں کہ مقہور و بے بس دنیا کو نجات دلانے کا سامان کر پاتا۔ اس میں تو یہ نظریہ فروغ پا کر ذہنوں میں راسخ ہو چکا تھا کہ روزی اللہ دیتا ہے اب کوئی کتنا بھی سعی و عمل سے کام لے روزی کے بارے میں اس کی سوچ

مشرکانہ سوچ ہوگی۔

اس جہالت اور لاعلمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کمیون سسٹم کو اپنایا گیا تو اسلام سے مشورہ تک نہیں لیا گیا اور مشورہ نہ لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر یہ سسٹم بھی استعماری شکل اختیار کر کے برے انجام سے دوچار ہوا بلکہ سامراجی دنیا کا حلقہ بگوش ہو کر اپنا وجود ہی کھو بیٹھا۔

محمدؐ رسول اللہ پہلے انسان ہیں جنہوں نے اجتماعیت کا تصور دے کر انفرادی بالا دستی کا پوری توانائی سے مقابلہ کیا اور مقہور دنیا آپؐ کی سحر آفریں شخصیت اور آپ کے حیات بخش فلسفہ معاش سے متاثر ہو کر کھچا کھچ آپؐ کی جانب چلی آئی اب قیصرو کسریٰ نے محکوموں کے لئے جو طوق و سلاسل خاص کر رکھے تھے قرآن کی ایک ہی ضرب سے ٹوٹتے چلے گئے لیکن آج آپؐ کے ماننے والے خود ہی آپؐ کے مشن و مقاصد کی نفی کرتے ہوئے پھر سے "نج کاری" کے نئے روپ میں پوری دنیا کے گرد غلامی کا وہی پرانا ہالہ کھینچ رہے ہیں جو صدیوں سے کھینچا ہوا تھا۔ پاکستان کا صنعتکار جو بلاشبہ امریکی شیطان کا پرستار ہے' پوری توانائی سے اس کا خیر مقدم کر رہا ہے اور بزور شمشیر قومی املاک کو حقیر معاوضوں میں خرید کر اپنی خدائی میں اضافہ کر رہا ہے اب دنیا بے بس و مقہور بن کر حیرت سے "تک" رہی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے نج کاری سے تو روزی کے ذرائع محدود اور معاش کے وسائل مفقود ہو جائیں گے لوگ تلاش معاش کے لئے مارے مارے پھریں گے انہیں نوکریاں کون دے گا؟ نج کار تو سو آدمیوں کا کام 25 آدمیوں سے لے کر زر اندوزی میں اضافہ کرتا رہے گا۔ اب نج کاری والے نہ ٹیکس دیں گے نہ بجلی کے بل ادا کریں گے نہ داد ہو گی نہ فریاد۔ ملک کے پاسبان خود ہی رہزن بن کر ایسٹ انڈیا کمپنی کا کردار ادا کرتے رہیں گے ان کا ہاتھ کون روک سکے گا قانون بنائیں گے تو اپنی حفاظت کا۔ معیشت استوار کریں گے تو اپنے مفادات کی۔ ضمیروں کی خریداری عام ہو گی عدالتیں بکیں گی۔ ممبران فروخت ہوں گے فوج کو نجی لشکروں کی حیثیت دے دی جائے گی ایسے میں انصاف کہاں سے ملے گا اسلام کا نظام زر شکنی کیسے نافذ ہو گا قرآن

کے ضابطہ "العفو" کا کیا بنے گا معیشت میں مساوات کا قرآنی فارمولا کیسے متعارف ہو گا؟ خاص کر سرمایہ کے زور پر مذہب و سیاست کا رشتہ ازدواج جب عام ہو گا تو بخ کاروں کے غلبہ کے خلاف کسی میں لب ہلانے کی جرات کیسے ہو گی؟ یہاں ماضی میں مودودیوں' اشرافیہ اور فوجیوں نے مل کر جب دنیا کے بدترین سامراج کو سہارا فراہم کیا تو کیا یہ لوگ اپنے سامراج کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت کر پائیں گے؟ اس کا جواب نفی میں ہے اور غالباً نفی ہی میں رہے گا تاہم مایوسی نہیں ہم قرآن والے ہیں ہمیں باطل سے نمٹنے کا طریقہ آتا ہے ہم اپنوں کے ستم زدہ ہو کر بھی ان کے باطل کا منہ پھیرنے کی سکت رکھتے ہیں اور ساٹھ کا عشرہ گواہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ادنیٰ غلام نے مودودی کے باطل پرست کاسۂ سر پر حقائق کا ہتھوڑا مار کر اس کے باطل کو راستہ بدلنے پر مجبور کیا تھا ہوا یوں کہ مودودی صاحب نے 1952م کو ملتان سنٹرل جیل میں سے "مسئلہ ملکیت زمین" کے عنوان سے ایک تفصیلی تحریر شائع کی تھی جس سے خوش ہو کر جاگیرداروں نے تقریباً دس ہزار کاپیاں خرید کر تقسیم کیں اور کوئی نہ تھا کہ ان کے سامنے دم مارنے کی جرات کرتا بالآخر قرآن والوں میں سے ایک طالب علم نے مودودی للکار کو سنجیدگی سے لیا اور 1968ء میں "زمینداری' جاگیرداری اور اسلام" کے نام سے دفاعی مورچہ سنبھالا اور پھر ایسا ہوا کہ یہ دفاع — جارحیت میں بدل گیا اور لشکر صالحین کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا مزید ہزیمت یہ کہ جب نظام مصطفیٰ کی تحریک چلی اور طبقہ علما نے حد ملکیت کو "نظریہ ضرورت" کے ماتحت قبول کر لیا تو مودودی صاحب نے پوری ڈھٹائی سے 52م کے ایڈیشن کی باتیں حذف کر ڈالیں اور جو حد ملکیت اشتراکیت کا خاصہ تھا اسلام کا لازمہ بنا کر اس میں سمو دیا۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جاگیرداری ہو خواہ بخ کاری نتیجہ کے لحاظ سے دونوں ہی جڑواں بہنیں ہیں اسلام سے منسلک نہیں ہو سکتیں اور جہاں تک اسلام کی معاشی پالیسی کا تعلق ہے وہ معیشت پر کسی بھی طرح کی اجارہ داری قائم نہیں کرتا وہ بتلاتا ہے کہ بندے بھی اللہ کے ہیں اور ملکیتیں بھی اللہ کی ہیں لہٰذا ملکیتوں سے ضرورت

جتنا لے لو باقی کو کھلا چھوڑ دو ــــ لیکن یہ فطری نظام کم از کم پاکستان میں نہیں چل سکتا یہاں مذہبی سامراج نے رفاہیت اور فلاح عامہ کے تمام منصوبوں پر اجارہ داری قائم کر کے نجی تصرف کی چیز بنا ڈالا ہے اب یہاں رزق کے سرچشموں پر ان ہی کا قبضہ ہے۔ شیوۂ خداوندی کے مطابق روزی کو کھلا نہیں چھوڑا جا سکتا تاہم اسلام نے مسلمانوں کے بدترین دور ملوکیت میں بھی زمینی ہمہ پیداوار' کانوں' کاریزوں وغیرہ کو نجی تصرف میں دینے کی مخالفت کی اور اجتماعی تحویل کی شے قرار دیا ہے۔ آئندہ کے صفحے اسی اجتماعیت کی تفصیل کے لئے حاضر ہیں۔

صنعتی جاگیریں

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے جاگیرداری کئی طرح کی ہے منجملہ زرعی' تجارتی اور صنعتی بھی ہے قرآن فرماتا ہے ــــ **وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِھِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَھُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ** ــــ (نحل 71) ــــ یہ آیت معیشت کے بارے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے اسکا مفہوم یہ ہے کہ ــ اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر باعتبار روزی کے برتری دے دی ہے (کہ کوئی زیادہ کماتا ہے کوئی کم) تاہم زیادہ کمانے والا اسکا مجاز نہیں کہ اپنے ماتحتوں کی روزی ان پر نہ لوٹا دے۔ جبکہ صورت حال یہ ہے کہ روزی کے باب میں سب ہی برابر ہیں۔

یہاں امام رازی (1270م) کا یہ تصور کہ آیہ ہذا سے سعادت اور شقاوت کا اثبات ہوتا ہے کم تنگی کی دلیل ہے اس میں تو صرف یہ وضاحت ہے کہ ہر انسان کی ذہنی اور جسمانی استعداد یکساں نہیں ہوتی اس لئے وسائل معیشت کے حصول کے اعتبار سے سب کی حالت یکساں نہیں ہوتی کسی نے وسائل معیشت پر زیادہ قابو پا لیا کسی نے کم۔ کسی کو کمانے کے زیادہ مواقع ملے کسی کو تھوڑے۔ پہلے جسمانی قوت میں مقابلہ ہوا اور طاقت ور نے کمزور کو مغلوب کیا پھر ذہن اور جسم کا مقابلہ شروع

ہوا اور ذہنی قوت نے جسمانی قوت کو مقہور کر لیا لیکن اس تفاوت نے کمزور کو روزی کے حق سے نہ تو محروم کیا اور نہ ہی اسکی سعی و عمل کو بے ثمر ٹھہرایا وہ کہتا ہے کہ ـــــ معیشت کے زیادہ مواقع ملنے والے کو یہ حق نہیں مل جاتا کہ اپنی انفرادی زندگی ہی کے لئے تمام ساز و سامان کو خاص کر دے جبکہ وسائل زندگی کسی خاص انسان کی حقیقی ملکیت نہیں بن سکتے یہاں جو کچھ ہے تمام نوع انسان کے لئے ہے کسی کے زیادہ کمانے پر پابندی نہیں ہے لیکن زیادہ آمدنی دراصل نوع انسان کی ایک امانت ہے وہ اس پر قابض رہ سکتا ہے لیکن اسے صرف اپنے لئے خاص نہیں کر سکتا اسکے کاروبار میں معاون' ماتحت اور مزدور نفع میں برابر کے شریک ہیں ـــــ **مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ** ـــــ استعارہ ہے ان تمام ہاتھوں اور ذہنوں کا جنہوں نے مل کر اپنی صلاحیتوں سے فیکٹری' کارخانے' مل اور ملٹی نیشنل کاروبار کو کروڑوں اربوں کے منافع میں تبدیل کیا یہ سادہ مفہوم آیہ زیر بحث کا ماحصل ہے ہند کے بڑے سکالر ابوالکلام (1958م) بھی یہی مفہوم لیتے تھے ۔

تحریف کا سہارا

لیکن تقدیر کے ماروں کو یہ مفہوم نہیں بھایا وہ قرآن کی نوک و پلک درست کرتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ یہ جو آیت کے آخر میں فرمایا کہ **فھم فیہ سواء** یعنی آجر (مالک) اور اجیر (مزدور) حصول معیشت کا مساوی حق رکھتے ہیں تو یہ دراصل استفہامی لہجہ یعنی "فھم" سے پہلے الف کا اضافہ ہے جو قرآن لکھنے والوں سے رہ گیایا انہوں نے دانستہ حذف کر دیا ورنہ اصل میں تھا **افھم فیہ سواء** بھلا کام دینے والا اور اجرتی مزدور بھی کبھی برابر ہو سکتے ہیں' یعنی کہ نہیں ہو سکتے۔ اس طرح وہ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے خود ہی مساوات کی نفی کر دی ہے۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون**

صلے کا معیار پیسہ ہے یا عمل؟

پس ہر گاہ کہ نحل (71) کی رو سے کاروبار کے نفع میں آجر اور اجیر برابر کے سہیم ہیں تو یہاں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے کہ صلہ کا معیار کیا ہے؟ کیونکہ نحل 71 میں شرح کی تفصیل نہیں ہے۔ صرف یہ وضاحت ہے کہ رزق کے حصول میں جتنے ہاتھ کام کریں گے یکساں حصہ پائیں گے۔ تو اس کے جواب میں مدینے کے بڑے امام مالک بن انس (795م) نے سورہ نجم کی آیات (39' 40) کی طرف رجوع فرمایا جہاں انہیں یہ رہنمائی ملی کہ — **اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ○ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ○** انسان بقدر سعی صلہ پاتا ہے اور یہ حقیقت شک و شبہ سے بالا ہے کہ محنت کا صلہ ضرور ہے (39' 40)

یہاں "سعی" کا لفظ دو بار استعمال ہوا ہے، جو لغت اور ادب کے لحاظ سے عمل سے مربوط ہے ہاتھ' پاؤں کا عمل — ذہن اور جسم کا عمل غرضے کہ عمل ہی عمل۔ اس بناء پر امام موصوف کا استدلال ہے کہ صلہ کا معیار عمل (ورک) ہے **لہٰذا لیقدر اجر العامل بضعف الربح** —— محنت کش کی اجرت کا تعین منافع کے نصف کے برابر کیا جائے۔ (**محمد الغزالی۔ الاسلام المفترٰی علیہ طبع قاہرہ 1955 ص 110**)

اس طرح امام مالک کے نزدیک نحل میں جس معاملہ کو حسب ضرورت کہا گیا تھا نجم نے اسے محنت و سعی سے مربوط کر کے صلہ کا معیار محنت ہی کو قرار دیا اور اسے لے کر ہی امام مالک نے شرح کا تعین بھی کر دیا ہے' جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ نفع میں محنتانہ کی شرح وقت کے لحاظ سے کم و بیش بھی ہو سکتی ہے **و ھو المقصود** بات صاف ہو گئی کہ نج کاری کے عمل میں بھی تمام ان افراد کا حصہ ہو گا جو فیکٹریوں' مل مالکوں' سرمایہ داروں کے لمبے چوڑے زمینی فارموں اور ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے زیر نگرانی لاکھوں کی تعداد میں محو عمل رہتے ہیں۔

زکوٰۃ دے کر بھی صنعتی جاگیردار نہیں بچ سکتا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ صنعتکار یا بڑا تاجر زکوٰۃ دے کر اپنی اربوں' کھربوں کی دولت محفوظ رکھ سکتا ہے مزید کچھ ادا کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے—— ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو مگر قرآن نے قانون زکوٰۃ کے ساتھ "انفاق" کا ایک مستقل مالی ضابطہ "العفو" بھی دیا ہے جو کہ کسی کی ملکیت تسلیم کرنے سے ابا کرتا ہے وہ قابض کو امین اور خزانچی کی حیثیت دے کر زائد کا صرف محافظ مانتا ہے یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمرؓ کے صاحبزادے جن کا فقہائے مدینہ میں بڑا مقام ہے۔ صحابی اور ابن صحابی تھے یعنی عبداللہ بن عمر(692م) وہ اور لغت و ادب کے راہوار امام مجاہد(722م) فقہ اور حدیث کے شناسا امام شعبی (721م) اور تابعوں میں قد آور امام طاؤس (724م) کہتے تھے کہ ان فی مالک لحقا سوی الذکوٰۃ—— زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی زکوٰۃ نکالے مال میں "ملت" کا حق ہے وہ ضرورت پڑنے پر لے سکتی ہے۔ (المحلی۔ ابن حزم طبع قاہرہ جلد 159/6) اور اندلس کے بڑے امام ابن حزم(1064م) یہ نقطہ نظر بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ہمارا بھی اسی پر عمل ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے باوصف زائد پر سٹیٹ کے ضرورت مندوں کا حق ہے۔

زمین کو انفرادی ملکیت بنانے کی ممانعت ۔

جناب ابراہیم التیمی سے روایت ہے کہ عراق فتح ہونے پر مجاہدین نے مطالبہ کیا کہ اسے مسلمانوں پر تقسیم کر دیا جائے اس کے جواب میں حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا فما لمن جاء بعدکم من المسلمین؟ زمینیں تو تم لے لو۔ تمہارے بعد آنے والے مسلمانوں کا کیا بنے گا وہ کہاں سے کھائیں گے؟ ایک روایت میں ہے کہ مطالبہ کرنے والوں میں حضرت بلالؓ (680م) زیادہ نمایاں تھے اور حضرت عمرؓ نے بھی قائد وفد بلال اور اس کے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر یہی فرمایا تھا کہ—— تریدون ان یاتی اخر الناس لیس لھم شی؟ تم یہ چاہتے ہو کہ سرزمین عراق کے

حصے بخرے کر کے تم ہی مالک بن جاؤ اور تمہارے بعد جو بھی انسان آئے تو اس کے لئے کچھ بھی نہ ہو؟ (کتاب الاموال ابو عبیدہ 748م حدیث نمبر146 و نمبر147 و صفحہ 57 و صفحہ 58 سطر8) فاروق اعظم کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز بھی مسلمانوں کے لئے "زیست" کا سامان کرے وہ انفرادی نہیں بن سکتی اسے سب کی مشترکہ میراث کی حیثیت سے بیت المال اور دیانتدار حکومت کے کنٹرول میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ آپ نے قبل اس کے کوئی "حساس" چیز جس سے "مفاد عامہ" وابستہ ہو کسی کی ملکیت میں چلی جائے اسے روک رکھنے کا فیصلہ صادر فرمایا۔

غیر منقولہ ـــــ کو انفرادی ملکیت سے نکالنے کا حکم

امام یزید بن ابی حبیب (744م) روایت کرتے ہیں کہ عراق فتح ہونے پر امیر المومنین عمرؓ بن خطاب نے عراق کے فاتح اور گورنر سعدؓ بن ابی وقاص (675م) کو لکھا کہ تم نے فتح عراق میں ہاتھ لگے مال کی تقسیم کے بارے میں دریافت کیا ہے تو سن لو ـــــ فوج نے غنیمت کی جن اقسام کو حاصل کیا ہے وہ اگر جائیداد منقولہ قسم کی ہیں تو ـــــ **فاقسمه بين من حضر من المسلمين** ـــــ اسے حاضر مسلمانوں میں بانٹ دیجئے اور اگر جائیداد غیر منقولہ ہے **واترک الارض و الانهار لعمالها** تو زمینوں اور نہروں کو پرانے کاشتکاروں کے پاس رہنے دیجئے۔ کیونکہ یہ زمینیں اور نہریں آنے والے مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہیں ـــــ **فانا لو قسمنا ها** انہیں اگر ہم نے تقسیم کر ڈالا تو آنے والوں کے لئے کچھ بھی نہ بچے گا **فانا لو قسمنا ها بين من حضرلم يكن لمن بعدهم شئى** (الاموال طبع اول صفحہ 59۔ الخراج ابو یوسف صفحہ 44ـ کتاب الخراج یحییٰ بن آدم طبع قاہرہ 1347ھ صفحہ 27 و صفحہ 28 حدیث نمبر119 و ص 111)

تقسیم غنائم کے ضمن میں فاروق اعظمؓ کا یہ نیا حکم واضح کرتا ہے کہ وحی الٰہی نے تقسیم کا جو عام اصول دے دیا تھا فاروق اعظم اسے جائیداد منقولہ سے خاص

کرتے اور گھوڑوں' مویشیوں' متروکہ اثاثہ اور میدان جنگ میں ہاتھ لگے ساز و سامان وغیرہ کی تقسیم تک محدود فرماتے تھے اور غیر منقولہ مثلاً زمینوں اور بھاری محلات و قصور جو ناقابل انتقال ہوتے تھے انہیں مسلمانوں کی مشترکہ میراث ٹھہرا کر صرف کاشت کاری کے حقوق دے کر اصل مزارعوں کی تحویل میں رہنے دیتے تھے اس طرح زمین نہ قابل ورثہ ہوتی نہ تملیک وہبہ ہو سکتی تھی اسے نہ فروخت کیا جا سکتا تھا نہ مالکانہ حیثیت سے کوئی اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔

مودودی صاحب بپھر گئے۔

پاکستان میں نظام سرمایہ داری کے بڑے نقیب سید ابو الاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں کہ زرعی زمین میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بناء پر صرف اسی کے معاملہ میں اسلام ملکیت کے عام اصول کو بدل دے (مسئلہ ملکیت زمین پہلا ایڈیشن صفحہ 52 و صفحہ 53)

تنہا فاروق اعظمؓ ہی نے زمین کو اجتماعی ملکیت بنانے کا جرم نہیں کیا دیگر قد آور صحابہ بھی آپ کے اس جرم میں شامل تھے ان میں یمن کے عہد رسالت کے گورنر حضرت معاذؓ بن جبل (639م) بھی ہیں خلیفہ عراق سیدنا علیؓ (661م) اور سیدنا سفیانؓ بن سعید بھی۔ تفصیل آگے آ رہی ہے اس طرح صحابہ میں سے کوئی نہیں جس نے فاروقی فیصلہ سے اختلاف کیا ہو؟ لہذا جہاں تک مودودی کے کہنے کا تعلق ہے تو اسے ہم استعماری ذہن کی تخلیق ٹھہرا کر مسترد کرتے ہیں کیونکہ اس نظام میں صرف اپنی ذات کی پرورش ہوتی ہے خلق خدا محروم کر دی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ذیلدار پارک لاہور کے بے تاج بادشاہ سید ابو الاعلیٰ تو عیش و رفاہت کی زندگی بسر کرتے اور ان کے بڑے بھائی سید ابو الخیر مودودی ضروریات کی تکمیل سے بھی عاجز تھے تنگ دستی اور عسرت نے آپ کو اس قدر نڈھال کر دیا تھا کہ ناقابل بیان ہے۔ یہ بھی خوب کہی کہ ملکیت کے عام اصول بدل دیئے؟ جناب والا عام اصول نہیں

بدلے محل (71) کے تناظر میں فیصلے کئے گئے۔ خاص کر یہ شکوہ اس وقت ہی بر محل ہوتا جب متروکات منقولہ کو بھی اجتماعی بنا دیا جاتا۔

اجتماعیت کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا۔

سابقہ توضیحات کے سلسلہ میں ذیل کا واقعہ اہم حیثیت رکھتا ہے یعنی حضرت معاذؓ بن جبل' فاروق اعظمؓ سے مخاطب ہوتے ہیں اے خلیفہ رسولؐ ! آپ اگر علاقہ جابیہ کی زمینیں مسلمانوں میں بانٹ دیں گے تو بخدا اس کے نتیجہ میں جو صورت حال نمودار ہو گی وہ یقیناً ناگوار ہو گی اور اس پر قابو پانا ممکن نہ ہو گا کیونکہ آپ نے "جابیہ" کا سرسبز علاقہ اگر نجی ملکیت بنا ڈالا اور لوگ مالکانہ حیثیت سے اس پر قابض رہے تو ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کوئی ایک مرد یا کوئی ایک عورت اس خطے کے تن تنہا مالک ہو بیٹھیں گے اور پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسلام کو حاجت روا سمجھ کر ایک (غیر مسلم) قوم مسلمان ہو جاتی ہے لیکن مسلمان بننے کے بعد اس بھری کائنات میں اس کے لئے کوئی چیز بھی باقی نہیں بچ پاتی جس سے وہ اپنی بقاء اور غذائی ضرورت پوری کر سکے — **و هم لا یجدون شیئا** — وہ اپنی بھوک و ننگ کا مداوا کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں پاتے لہٰذا حضور والا آپ اجتماعیت کا احساس فرمائیں اور جابیہ کو انفرادی بنانے کا خیال ہو تب بھی اسے ترک فرما دیں اور ایسا عادلانہ فیصلہ کریں جو موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے یکساں مفید ہو **فانظر امرا۔ یسع اولهم و اخرهم** (کتاب الاموال صفحہ 59 و صفحہ 60 سطر 7 تا 9)

اسکے بعد ابو عبیدہ نے لکھا ہے کہ جناب علیؓ کرم اللہ وجہہ اور سفیانؓ بن سعید نے بھی اپنی رائے میں واضح کیا تھا کہ زرعی اراضی کو نجی تصرف میں بالکل نہ دیا جائے (صفحہ 60 سطر 10)

معاوضہ دے کر انفرادی ملکیت کا خاتمہ۔

نقیب راسمالیت فیصلہ فاروقی پر ہٹ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقوں سے زمینوں پر قبضہ نہ کیا جائے بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خریدے تو اسلامی نقطہ نظر سے اس میں قباحت نہیں ہے — یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے نہ کہ اسلامی (مسئلہ ملکیت زمین صفحہ 71 سطر 3 تا 8)

اور اشتراکیت ان کی حد تعبیر کے مطابق لادینیت اور کفر ہے — آیئے اب اس ہرزہ سرائی کا واقعاتی جائزہ لیں۔

ابوعبیدہ قاسم بن سلام اور بغداد کے چیف جسٹس قاضی ابو یوسف (789م) بیان کرتے ہیں مسلمانوں نے جب عراق فتح کیا تو مجاہدوں میں تین چوتھائی کے برابر (Bajeela) قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے فاروق اعظمؓ نے اس خیال سے کہ ان کی دلجوئی بھی ہو جائے گی اور کچھ زمینیں گزارہ یونٹ کی حد تک ان کے پاس رہنے بھی دیں۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ حضرت عمار بن یاسر (657م) حضرت جریر بن عبداللہ البجلی کے ہمراہ عراق سے مدینہ طیبہ روانہ ہوئے جب یہ وفد عمر خطاب کی خدمت میں حاضر ہوا تو فاروق اعظمؓ نے بجیلہ قبیلہ کے سردار جناب جریر سے باتوں باتوں میں اپنا خیال ظاہر کیا کہ **لولانی قاسم مسئول لکنتم علی ما جعل لکم** — اگر میں ذمہ دار تقسیم کار نہ ہوتا تو تمہاری زمینیں اسی حال پر تمہاری ہی ملک میں رہ جاتیں جیسے کہ ماضی میں تھیں لیکن میری ذمہ داری ہے کہ **ولوی الناس قد کثروا فاری ان ترده علیهم** — تمہیں عطا کردہ زمینوں پر نظر ثانی کروں کہ اب کثرت آبادی ملکیت زمین کے سابقہ نظریہ کو بدلنے کی متقاضی ہے لہٰذا میں نے فیصلہ کرلیا ہے تم معاوضہ لے کر اپنی زمینیں قومی تحویل میں دے دو — چنانچہ بجیلہ قبیلہ کے سردار جناب جریر رضی اللہ عنہ آمادہ ہو گئے اور فاروق اعظمؓ نے طے شدہ معاوضہ (فی کس

سونے کے اسی 80 دینار) اسی وقت ادا کر دیئے (الاموال صفحہ 61 سطر 17 تا 19
— الخراج ابو یوسف صفحہ 31)

اس روایت میں فاروق اعظم کی زبانی ان لوگوں کو مسکت جواب دیا گیا ہے جو اجتماعیت کی اسلامی پالیسی پر تعجب کرتے اور اشتراکیت سے موسوم ٹھہراتے ہیں — تعجب ہے کہ سید مودودی نے اجتماعیت کی یہاں تک مخالفت کی ہے کہ زمین کا مالک چاہے تو دوسروں کو آباد کرنے کے لئے دینے کی بجائے غیر آباد اور بنجر ہو جانے دے اس کی ملکیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ (مسئلہ ملکیت زمین صفحہ 71)

یہ بات وہ شخص کر رہا ہے جو اپنے زعم میں تاریخ اور حدیث کا زیادہ علم رکھنے کا مدعی ہے حالانکہ تاریخ کا تھوڑا سا علم رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ رسول اللہؐ نے جن اشخاص کو آباد کاری کے اصولوں پر جو قطعات ارزاں فرمائے تھے شرط یہ تھی کہ اگر کوئی رقبہ 3 سال تک بنجر رہا تو کاشتکاری کا حق ختم کر کے کسی دوسرے کو دے دیا جائے گا (تفاصیل کے لئے ملاحظہ ہو—"اور جاگیر ضبط ہو گئی" —نیز "زمینداری' جاگیرداری اور اسلام" —— زمینوں کو اجتماعیت کے مفاد کی خاطر خرید کر قومی ملکیت میں شامل کرنے کا ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو' بجیلہ کی زمینوں کا فیصلہ ہو چکا تھا اب تمام زمینیں معاوضہ دے کر قومی ملکیت میں شامل کر لی گئی تھیں کہ اسی قبیلے کی ایک عورت ام کرز— نالش کناں خلیفہ کے ہاں پیش ہوئی کہ حضور والا آپ نے کثرت آبادی کے نام پر ہمارے قبیلے کی تمام زمینیں خرید لی ہیں لیکن مجھے تاحال معاوضہ نہیں ملا۔ یعنی میرے مرحوم والد کو بھی آپ نے تقسیم اموال کے وقت زمین دی تھی جسکا سرکاری ریکارڈ میں ثبوت موجود ہے۔ مجھے اس کا معاوضہ چاہئے۔ خلیفہ نے فرمایا میں نے سب کو معاوضہ دے کر فارغ کر دیا ہے اب یہ تیری قوم کے ذمہ ہے کہ تجھے معاوضہ فراہم کرے اسکے جواب میں ام کرز نے کہا کہ کچھ بھی ہو میری قوم نے جو کچھ کیا سو کیا۔ میں نے کچھ بھی وصول نہیں کیا آپ جب تک مجھے ایک اونٹنی جس پر سرخ رنگ کا نمدہ ہو بٹھا کر میری مٹھی معاوضے کی رقم سے بھر نہ دیں گے میں نہیں ٹلوں گی چنانچہ فاروق اعظم نے اسے بھی سونے کے اسی دینار دے

کر رخصت کر دیا (اور او نٹنی مستزاد) (الاموال صفحہ 61 حدیث نمبر155 و صفحہ 62 سطر3)

سرزمین فراعنہ اجتماعی قانون کی زد میں۔

نہ صرف دجلہ و فرات کی زمینوں کو معاوضہ دے کر یا بلا معاوضہ قومی تحویل میں دے دیا گیا حضرت سفیان بن وہب الخولانی (701م) فرماتے ہیں کہ

> حضرت عمرؓو بن العاص (664م) نے جب مصر فتح کیا تو حضرت زبیرؓ (658م) نے خیبر کی طرح نیل کی اراضی کو بھی مجاہدوں میں بانٹ دینے کا مطالبہ کر دیا —— جس پر مصری گورنر اور فاتح نے جواب دیا کہ مرکز خلافت سے دریافت کیا جائے جب تک وہاں سے وضاحت نہیں آتی انتظار کریں پھر جب وضاحت آئی تو آپ نے حضرت زبیر و دیگر صحابہ کو بلوا کر سنائی —— اس میں لکھا تھا کہ نیل کا شاداب اور سر سبز علاقہ بغیر تقسیم کے بیت المال (قومی خزانے) کی تحویل میں دے دیا جائے۔ (الاموال صفحہ 58 حدیث نمبر144)

عراق و شام کی طرح مصر میں رزق کا اہم سرچشمہ زراعت ہی تھی آپ نے یہاں بھی کسی کی ذاتی اجارہ داری کو جھٹک دیا۔

قرون اولیٰ میں اجتماعیت کا موجودہ تصور نمایاں تھا۔

زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر اجتماعی تحویل میں دینے کے واقعات پر دوسری صدی ہجری کے ماہر معاشیات امام ابو عبیدہ قاسم بن سلام تبصرہ کے بطور لکھتے ہیں —— اداہ۔ اراد ان یکون فیئا موقوفا للمسلمین ماتنا سلوا یرثہ قرن من قرن فتکون قوۃ لھم علی عدوھم —— میں سمجھتا ہوں فاروق اعظمؓ نے زمین کو نسلاً بعد

نسل آنے والے کے لئے مشترکہ ورثہ بنانے کا فیصلہ کر کے نہایت صحیح اور درست اقدام کیا تھا تاکہ قرنہا قرن (ابد الاباد) تک آنے والے مسلمانوں کی معیشت توانا اور باقوت رہے کمزور نہ ہونے پائے تاکہ دشمن ان کی قوت سے لرزاں رہیں۔ (الاموال صفحہ 58 سطر 18 تا 19 صفحہ 60 سطر 7 تا 9)

سیدنا فاروق اعظمؓ اور صحابہ کرامؓ کی ان پالیسیوں سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں (الف) وہ تقسیم غنائم کو جائیداد منقولہ سے خاص کرتے اور غیر منقولہ کو شامل نہ کرتے تھے (ب) پہلے جن کو تقسیم کے وقت زمینیں دے بیٹھے تھے بعد میں شدید دباؤ یا ذہنی فیصلے کے ماتحت نظر ثانی سے کام لے کر عطیہ کردہ زمینوں کا معاوضہ تجویز فرمایا اور وہ لوگ بھی نقد پیسہ ہی لینا چاہتے تھے یا اس پر راضی ہو چکے تھے جس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اگر ان دنوں فوجیوں کو نقد پیسہ بطور مشاہرہ دیا جاتا تو وہ منقولہ اموال سے بھی دست بردار ہو سکتے تھے۔

واقعہ خیبر کا بہانہ۔

فقیہان سامراج مذکورہ بالا تفاصیل کو نہیں مانتے اور تقسیم غنائم خیبر کو اساس ٹھہراتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ خیبر میں نبی اکرمؐ نے جہاں زمینیں تقسیم کی تھیں وہاں بٹائی کے قدیم سسٹم کو بھی رہنے دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ واقعہ خیبر بالکل منفرد واقعات میں سے ایک واقعہ تھا جس کے لئے نہ تو رن پڑا اور نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ چلائے گئے۔ اہل خیبر نے خود ہی میدان جنگ نہیں گرمایا اور اطاعت کی غرض سے گھروں میں بیٹھ گئے اس طرح میدان میں پڑے ان کے اموال اور اثاثوں نے "فئی" کی حیثیت اختیار کر لی جبکہ "فئی" کا اصول یہ ہے کہ اس میں فوجیوں کا حصہ نہیں ہوتا کہ فوج استعمال ہی نہیں ہوئی اور جب استعمال ہی نہیں ہوئی تو ان کی جانب سے کوئی مطالبہ بھی نہ ہو سکتا تھا — ادھر معروضی حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ مسلم معاشرہ اشاعت اسلام کے لئے حرکت کناں تھا مسلمان

سامان حرب و ضرب کی قلت کے باعث دشمنوں کو ہزیمت سے دوچار کر دینے سے قاصر تھے لہٰذا نبی اکرمؐ نے محسوس فرمایا کہ آپ کے پاس کام کے آدمیوں کی کمی ہے انہیں ہی اگر بیل کی دم پکڑ کر ہل چلانے میں لگا دیا یا زمین دے کر مصروف بنا ڈالا تو اشاعت کا کام پروان نہ چڑھ سکے گا چنانچہ آپ نے سابقہ لوگوں کی زرعی املاک کو یا تو نہیں چھیڑا یا چھیڑا تو نارمل شرائط پر کاشت کا حق انہیں ہی دے دیا۔ امام ابو عبیدہ نے رسولؐ اللہ کے اس عمل کو ذہانت اور نبوت کا اہم فیصلہ ٹھہراتے ہوئے لکھا ہے **لم یکن لہ من العمال ما یکفون عمل الارض** صحابہ کرام اسلام کی اشاعت میں لگے ہوئے تھے اور نبی اکرمؐ کے پاس کام کرنے والے آدمیوں کی کمی تھی لہٰذا آپ نے پرانے کاشت کاروں ہی سے معاملہ کرنا پسند فرمایا۔ (الاموال صفحہ 56 سطر 12)

اس طرح یہ معاملہ ایمرجنسی بن جاتا اور بصیرت نبوی کا شاہد عادل بن جاتا ہے بلکہ یہ فیصلہ کوئی عام جنگجو نہیں کر سکتا' آپؐ جیسے زیرک اور فن حرب میں مہارت تامہ رکھنے والا جرنیل ہی کر سکتا تھا اور اس حد تک تو خود سید مودودی جو اس تمام خلفشار کے بانی ہیں کو بھی اعتراف ہے کہ آنحضرت نے یہ دیکھ کر کہ آپ کے پاس کام کرنے والے آدمیوں کی کمی ہے ان کی بات مان لی۔ (مسئلہ ملکیت زمین صفحہ 57 سطر 7 تا 8) ان کی بات مان لی یا اپنی بات منوا لی۔ اس پر گفتگو لاحاصل ہے۔ بہرحال بعد میں بھی ایسے ہی معروضی سوچ کو ملحوظ رکھ کر فاروق اعظمؓ نے قرآن کی روح کو باقی رکھتے ہوئے منقولہ اور غیر منقولہ غنائم میں تفریق کی اس سے نہ تو کوئی حکم معطل کرنا مقصود تھا نہ ہی کسی شریعت کی ایجاد۔ فرض کرو اگر سابقہ روایات کے مطابق فوجیوں کو دشمن کی املاک بانٹ بھی دی جاتی تھیں تو آج کے دور میں حربی تکنیک بدل جانے سے وہ روایات قائم نہ رہ سکتی تھیں آج فوجیوں کو بیرکوں میں رکھا جاتا ہے خوراک' پوشاک' صحت اور اعلیٰ ٹریننگ حکومت کے ذمہ ہوتی ہے فوجی خدمات کے عوض انہیں تنخواہ دی جاتی ہے اب دشمن کا ہاتھ لگا مال حکومت کا بن جاتا ہے اسکی انفرادی تقسیم کا رواج نہیں رہا بلکہ اسلام سے پہلے رواج میں پکڑے انسانوں کو غلام اور لونڈی بنانے کی بات بھی نہیں رہی تو کیا آج بھی سید مودودی قدیم روایت

کے مطابق ہی فوجیوں کو غنائم کے انتظار میں گھروں میں بٹھائے رکھیں گے؟

اجتماعیت کے لئے نجی تصرفات پر نگرانی۔

میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ سامراج اسلامی ہو خواہ مغربی ہو ان کی قباحت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دیکھئے سامراج ہی کے ایک نقیب سید مودودی جو بیک وقت مغربی سامراج کے نمائندہ بھی ہیں اور مسلم سامراج کے وکیل بھی —— اجتماعیت شکنی کے دلائل میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ انسان جس قدر چاہے مال' مویشی' برتن' مکان' موٹریں اور دنیا کا پر تعیش ساز و سامان رکھ سکتا ہے یہ تفاوت ایک قدرتی امر ہے اس تفاوت کو زکوٰۃ و خیرات سے قابل تلافی بنایا جا سکتا ہے (مسئلہ ملکیت زمین)

یہاں سید مودودی غلط فرما گئے ہیں یہ قدرتی تفاوت نہیں ہے **فھم فیه سواء** کی الہٰی وضاحت اس غلط نگہی کو جھٹلاتی ہے اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ اس تفاوت کو زکوٰۃ و خیرات سے قابل تلافی بنایا جا سکتا ہے؟ کیونکہ زکوٰۃ و خیرات تو عبوری اور تربیتی اصطلاحات ہیں انہیں منزل مقصود نہیں بنایا جا سکتا۔ منزل مقصود وہ سٹیج ہے جہاں پہنچ کر ہر چیز اللہ کی ملک بن جاتی اور بالواسطہ تمام نوع بشر کا اثاثہ ٹھہرتی ہے۔ یہ سوال رسول اللہؐ کے سامنے بھی اٹھا تھا کہ کیا یہ مال و مویشیوں' کارخانوں' فیکٹریوں اور مکانوں والے ہر چیز کے تنہا مالک متصور ہوں گے؟ رسول اکرمؐ نے وحی کی زبانی جواب مرحمت فرمایا کہ نہیں ضابطہ العفو کی رو سے ہر چیز ضرورت مندوں کی ملک ہے —**اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَ الْعِزَّۃُ لِلّٰہِ وَ لِرَسُوْلِہٖ**— چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ رسول اللہؐ کے جانشینوں اور جان نثاروں نے جان کی بازی لگا کر آپ کے مشن و اہداف کو پروان چڑھایا اور ضابطہ "العفو" اور نحل (71) کی رو سے ہر چیز کو حد سے رکھا۔ عرب کے مذہبی سکالر امام محمد الغزالی لکھتے ہیں ایک بار فاروق اعظمؓ نے گوشت مارکیٹ میں دیکھا کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ جو سب سے زیادہ زمینداری اور جاگیرداری کے خلاف اور خود کاشتی کے مبلغ تھے' معمول سے زیادہ گوشت خرید رہے تھے۔ اس پر

فاروق اعظمؓ سے رہا نہیں گیا اور آپ نے آئندہ کے لئے انہیں یہ کہہ کر وارننگ دی کہ کیا اپنے ہمسایوں اور بھائی بندوں کے لئے ایک دن بھی اپنے پیٹ کو گوشت خوری سے روک نہیں سکتے تھے دیکھتا ہوں تم روزانہ پہنچ جاتے ہو اور زیادہ گوشت خرید کر سب کی حق تلفی کر جاتے ہو۔ **(الاسلام المفتری علیہ واسمالین والشیوعین** طبع قاہرہ 195 صفحہ 136م)

غور فرمایئے۔ فاروق اعظمؓ اگرچہ نجی تصرفات کو حرام نہیں سمجھتے تھے تاہم ایسے تصرفات جو اجتماعیت کے لئے نقصان دہ ہوں ان پر نگرانی کرنا فرض بھی سمجھتے تھے۔ بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت جابرؓ بدری صحابی اور قد آور صحابہ میں سے تھے بااین ہمہ فاروق اعظمؓ نے جب انہیں وارننگ دی تو ــــ **علا درقه** ـــ آپ نے درے کو اونچا کر کے جابر کو تنبیہہ کی کہ پھر ایسی حرکت نہ کرنا ـــ اللہ اللہ اسلام کے اس حیات بخش نظام کو سامراجی نقیب کس بھونڈے انداز سے پیش فرما کر اللہ و رسول کے مشن کا منہ چڑا رہے ہیں اور سناتے ہیں کہ خود رسولؐ کا فرمان ہے کہ **اللہ ھو المسعر القابض** یعنی گرانی سے چیخ کر جب لوگوں نے کہا یا رسول اللہ **سعرلنا** آپ ہمارے لئے اشیاء پر کنٹرول پالیسی نافذ فرما دیں تاکہ ہم گراں فروشی سے بچ سکیں تو آپ نے فرمایا یہ تو اللہ کا کام ہے وہی اشیاء پر کنٹرول کرتا اور کم و بیش کرتا ہے۔ **(الاحادیث)**

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ کا یہ پالیسی فیصلہ صرف سامراجی نقیبوں ہی کو معلوم ہو سکا اور صحابہ کرام اس سے بے خبر رہے؟ کیا وہ حدیث کے منکر تھے؟ روایات میں ہے کہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد نبوی سے باہر نکلے تو حسب معمول لوگوں کو اجناس کی ڈھیریاں لگاتے دیکھا۔ آپ نے اپنے جائزے میں محسوس کیا کہ جناب **حاطبؓ بن ابی بلتعہ** (650م) منقیٰ بیچ رہے ہیں اور مارکیٹ ریٹ سے زیادہ بیچ رہے ہیں آپ نے فرمایا۔ حاطب میں جانتا ہوں تم تاجر ہو مگر میں نے معلوم کر لیا ہے تم دام زیادہ چکاتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ حضور یہ تجارت ہے۔ آپ نے فرمایا جی ہاں تجارت ہے آئندہ اگر یہ دھندا جاری رکھنا ہے تو مارکیٹ

ریٹ کے مطابق جاری رکھو ورنہ کل یہاں دکان نہیں دیکھوں گا۔

نوکر شاہی کا احتساب۔

سامراجی فلسفہ ہے کہ ملازمت کے اوقات کے بعد اپنے اوقات میں کاروبار کیا جا سکتا ہے وغیرہ۔ لیکن تاریخ بتلاتی ہے کہ خلیفہ اول سے لے کر سوم تک نے جب بار خلافت سنبھالا تو اپنا کاروبار دوسروں کے سپرد کر دیا۔ خزانہ سے اتنا مشاہرہ پاتے جتنا کہ ایک عام مزدور کما سکتا ہے لوگوں نے کہا اے صدیق اکبرؓ مزدور کی اجرت جتنا خرچ کر لینا تو آپ کے لئے کافی نہ ہو گا۔ فرمایا پھر ایسا کروں گا کہ مزدور کی اجرت بڑھا کر اتنی ہی تنخواہ لوں گا لیکن نہ خزانے کو نقصان پہنچاؤں گا نہ فاضل وقت میں کوئی کاروبار کروں گا آپ کا مفہوم یہ ہے کہ میں منصب و جاہ یا شخصیت کو اپنی ذات کے لئے استعمال نہیں کروں گا — بلکہ سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے حضرت عتبہ بن ابی سفیان (664م) کو علاقہ "کنانہ" (Kanana) کا والی بنا کر بھیجا—— جناب عتبہ جب ملازمت کی معیاد ختم کر کے مدینہ طیبہ لوٹے تو اپنے ساتھ بہت سا مال بھی لائے اور مسجد نبوی کے میدان میں اونٹوں کے کارواں سے مال جب اتارا گیا تو لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔ حضرت عتبہ نے اب اس مال کو دو حصوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا فاروق اعظم نے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ یہ زر و جواہر کے انبار بیت المال کے تو نہیں ہو سکتے تمہیں گورنر بنا کر بھیجا گیا ہے کسی علاقے کا فاتح نہیں۔ بتاؤ یہ مال کس کا ہے اور یہ کس کا؟— عتبہ نے صفائی بیان کی کہ امیر المومنین آپ کو بخوبی علم ہے کہ میں تجارت پیشہ ہوں اور اکثر امراء حکومت' ملازمت کے ساتھ تجارت بھی کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی فارغ اوقات میں تجارت کرتا رہا ہوں بلکہ جناب کو یہ بھی علم ہے کہ میں کنانہ کا چارج لینے سے پہلے بھی تجارت کا مال ساتھ لے کر گیا تھا— فاروق اعظم نے اس کی صفائی کو در خور اعتناء نہیں سمجھا کہ عام تاجر اتنا نفع نہیں کما سکتا یہ نفع منصب اور عہدے

کے باعث ہی وجود میں آیا ہے۔ چنانچہ آپ نے انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے عتبہ سے ایک بار پھر فرمایا — کہ تم نے اپنے منصب کو تجارت کے لئے کیوں استعمال کیا اور اس انداز سے اتنا مال کیوں جمع کیا؟ یہ کہتے ہوئے فاروق اعظمؓ نے فصیره فی بیت المال تمام تر مال بیت المال کی تحویل میں دے دیا (الاسلام المفتریٰ علیہ طبع قاہرہ صفحہ 90 و صفحہ 91)

حرف مکرر۔

مسلمانوں کے لئے اجتماعیت کوئی نئی چیز نہیں ہے وہ ابتدائے اسلام ہی سے اس سے مانوس و متعارف تھے پھر اسلامی سامراج کی یلغار نے اسے پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور صدیوں تک اسے دبائے رکھا پھر ایسا ہوا کہ بلقانی ریاستوں میں جسٹس بدر الدین محمود بن اسرائیل نے فتویٰ دے دیا کہ لن تکون کافۃ الاشیاء مثل الاکل و الملبس والحیوانات والا راضی مشترکۃ بین عموم الناس باستثناء النساء عورتوں کے سوا تمام اشیاء مثلاً روٹی' کپڑے' مکان' مویشیوں اور اراضی میں سب انسانوں کا حق مساوی ہے وہ برابر کے حصہ دار ہیں۔ (العربی نمبر 261 صفحہ 137 طبع کویت)

شیخ بدر الدین کا یہ انقلابی نظریہ بڑی سرعت سے پھیلا اور تمام بلقانی ریاستیں اس کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئیں۔ فاتح ایشیا امیر تیمور لنگ (1405م) اس کے گرویدہ ہو گئے اور زر و جواہر کے انبار شیخ کے نذر کر دیئے مگر بدر الدین محمود نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ — اس کا نہ تنہا میں مالک ہوں نہ تم۔ اس کے مالک عوام ہیں۔ (نوادرات مصنفہ بدر الدین بحوالہ العربی صفحہ 137)

شیخ بدر الدین قاضی القضاۃ بھی تھے اور سلطان برقوق (1399م) کے بیٹے سلطان فرخ کے اتالیق بھی — بایں ہمہ ایسا بھی ہوا کہ سلطان بایزید یلدرم (1402م) کے بیٹے سلطان محمد I (1421م) اس کے معاشی مساوات کے انقلابی

نعرے سے خوفزدہ ہوئے اور شیخ موصوف کے حریف جسٹس حیدر الہروی کے فتوے کے مطابق (1418م) تا 1420م — بلقان کے اس انقلابی انسان کو دھوکہ سے سولی پر جھلا دیا۔ لیکن بعد میں جبکہ رواں صدی میں روسی انقلاب نے بلقانی ریاستوں کو اپنی جلو میں لے لیا تو ان ریاستوں کی سیماونی پارٹی جو شیخ کے خیالات کی حامل تھی اور معاشی مساوات سے مانوس تو انہوں نے فورا کیمون سسٹم کو قبول کر لیا۔ بعد میں یہ سسٹم پورے ستر سال تک کامیابی سے چلتا رہا تاآنکہ بین الاقوامی سامراج کے معاون خصوصی پاکستان نے اسے ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تاہم گذشتہ پچاس سال سے چین کے ایک ارب انسانوں کا یہ محبوب نظریہ ہے بلکہ یہی سسٹم بتیس سال سے لیبیا میں بھی نافذ ہے اور اس کا نام اشتراکیۃ القرآن رکھا ہوا ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعیت اسلام ہی کا وطیرہ ہے۔ عالمی کیمونسٹ اگر قرآن سے رہنمائی حاصل کرتا تو عالمی سامراج اسے فنا کے گھاٹ نہ اتار سکتا تھا۔ لیکن لینن وغیرہ نے چونکہ اسلام کے ماخذ قرآن کا مطالعہ نہیں کیا تھا اس کی نظر ایک وسیع و عریض رقبے پر ملا و ملوک کے گٹھ جوڑ سے جو نظام رائج تھا اسے ہی اسلام سمجھ کر نزدیک پھٹکنے سے گریز کیا۔

غور فرمائیے تاریخ کا یہ تسلسل کتنا حیرت انگیز اور ہمارے دور کے حسب حال ہے اور ہم فخر کر سکتے ہیں کہ ملا و ملوک کے مسلم سامراج کے مسلط رہنے کے باوصف ہمارے خزینوں میں ایسے جواہر پارے محفوظ ہیں جن سے دنیا بے بہرہ ہے اور پھر نہ صرف یہ ادعا اور لاف ہے یہ وہ حقیقت بھی ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ ابو بکر و عمر اور عثمان سے لے کر ابو عبیدہ قاسم بن سلام اور اندلس کے معاشی مفکر امام ابن حزم، شیخ بدر الدین محمود بن اسرائیل تک سبھی نے اجتماعیت کے فلسفہ کو پروان چڑھایا عمل کیا اور قابل تقلید منصوبہ ٹھہرایا۔ ہمارے دور کے انقلابی امام عبید اللہ سندھی (1944م) اور علامہ اقبال (1938م) نے کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ — سوشلزم کو آزمانے کا موقعہ ملنا چاہیے، اسلام اس کی نفی نہیں کرتا۔ مرشد العام امام مصطفیٰ السباعی نے اشتراکیۃ الاسلامیۃ لکھ کر دنیائے اسلام میں تہلکہ مچا دیا کہ اجتماعیت

ہی اسلام کی اصل و بنیاد ہے بلکہ مودودی فلسفے کے برعکس اخوانی قیادت فلسفہ معاش میں مغربی سامراج کو کفر سمجھتی تھی عبدالقادر عودہ' محمد الغزالی و دیگر صاحبان علم و قلم اجتماعیت کے بڑے داعی اور موید رہے خود جمال عبدالناصر اخوانی ممبر تھے جو بعد میں سیاسی اختلافات کے باعث جدا ہو گئے تھے فلسفہ اجتماعیت کے دلدادہ تھے۔ ہند میں تحریک خلافت کے ایک مجاہد عبدالرحیم پوپلزئی' حیدر بخش جتوئی معاش میں قرآن سے رہنمائی لیتے اور شدت سے عمل پیرا ہونے کا درس دیتے تھے۔ ہمارے دور کے نامور قرآنی مفکر علامہ پرویز جو قرآن پاک کے امام اعظم تھے۔ ادیب تھے' شاعر تھے' خطیب تھے' دانشور تھے وہ بھی اجتماعیت ہی کو روح قرآن ٹھہراتے تھے۔ یہ درست ہے کہ آپ نے دور حاضر کی بعض معاشی اصلاحات کے پس منظر کو نشانہ بنایا جس سے بات میں تلخی پیدا ہو گئی لیکن اس سے ان کی فکر کی گہرائی متاثر نہیں ہو سکتی ان کی سیاسی رفاقت چونکہ لیگی اشرافیہ سے گہری تھی لہٰذا وہ کہیں کہیں حالات کے جبر کا مقابلہ نہیں کر سکے لیکن لیگی اشرافیہ کے کیمپ میں حسرت موہانی جیسے شیر دل انسان بھی تھے جو کھلم کھلا اجتماعیت کی حمایت کرتے رہے — یہ درست ہے کہ بعض اصلاحات خصوصی پس منظر رکھتی ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان کے واضعین کون تھے؟ بلاشبہ غیر مسلم مفکرین تھے ضرورت تھی کہ ہمارے بالغ نظر علماء انہیں قرآن کے پیغام سے آشنا کرتے لیکن یہاں تو بالغ نظر کیا نظر نامی کوئی چیز اپنے پاس رکھتے ہی نہیں تھے وہ کیا رہنمائی کرتے — بہرحال ہم دیکھتے ہیں اور قرآن خود بخود ہی اہل یورپ کے سینوں میں جگہ پا رہا ہے اور وہ غیر محسوس طور پر قرآن ہی کی طرف لپکتے چلے آ رہے ہیں۔ آج سپین' فرانس' برطانیہ' و دیگر نج کاری کی تباہ کاریوں کی کھلی مخالفت کر رہے ہیں اسے بے روزگاری عام کرنے کا بدترین وسیلہ ٹھہرا چکے ہیں ایسے میں صد حیف ہے کہ جو لوگ اپنے پاس قرآن رکھتے ہیں اور اس میں شب و روز کی تلاوت کرتے ہیں کہ یہ ان کے گلے میں طوق و سلاسل اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں معیشی غلامی نے ان کی سکت نابود کر دی ہے۔ یہ قرآن بذریعہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ و سلم ان بیڑیوں اور سلاسل کو توڑ کر ہمہ قسم غلامی سے نجات دلاتے

ہیں (اعراف۔157) وہی لوگ اٹھے ہیں نج کاری کا شیطانی پیغام عام اور پروگرام نافذ کرنے۔

نج کاری کا طاعون۔

کہا جاتا ہے کہ نج کاری کے ذریعہ کرپشن ختم ہو گی اور غیر ملکی قرضے اتر جائیں گے۔ لیکن اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ نج کاری کے سیاہ پردوں میں دولت آفرینی کے نئے تجربات کئے جا رہے ہیں مثلاً رواں سال (98م) کی جنوری کے دوسرے عشرے میں مری کے تین ہوٹلز 35 کروڑ میں بیچے گئے جبکہ سابقہ حکومت میں اسکی قیمت 2 ارب لگ چکی تھی جسے حقیر معاوضہ سمجھ کر فروخت نہ کیا جا سکا۔ اب ظاہر ہے کہ ایک ارب 65 کروڑ روپے کم قیمت پر فروخت کرنا بغیر مفاد کے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جی ٹی ایس کی اربوں کی املاک اونے پونے داموں فروخت کر کے خاص افراد کو فائدہ پہنچایا گیا آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے اگر کرپشن کا زور تھا تو انہیں ٹھیکے پر دیا جاتا قومی املاک غلط بخشی کی نذر تو نہ ہو جاتیں — اب 25 جنوری کو سنا ہے کہ ریلوے کے ساٹھ ہزار ملازم فارغ کئے جا رہے ہیں یعنی دانستہ بے روزگاری پیدا کی جا رہی ہے۔ اگر کرپشن ختم کرنے کے یہی جتن ہیں تو وقت آئے گا کہ پاکستان کہ چپہ چپہ فروخت ہو گا۔ تم اگر اہل ہوتے تو صرف کرپشن پر قابو پا لیتے پاکستان کے تمام دکھوں کا مداوا ہو جاتا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسلام کے نام پر اشرافیہ ایمپائر قائم کر کے اقبال سے بڑا دھوکہ کیا ہے۔ تمہارے قول و فعل میں تضاد ہے ایسے میں جہاں اسوہ رسول ؐ کی گنجائش نہ ہو وہاں اسلامی نظام کا خالی تصور بھی ابلہ فریبی ہے — تم کہتے ہو ہم نے وی آئی پی کلچر ختم کر دیا ہے یہ بھی غلط بیانی ہے فیصل مسجد کی پہلی دو صفوں میں صدر اور وزیر اعظم کے ماسوا کوئی بھی سجدہ ریز نہیں ہو سکتا جن دروازوں سے وی آئی پی سجدہ گاہوں تک پہنچتے ہیں وہاں مسلح کمانڈوز کھڑے ہیں کسی کو اندر جانے نہیں دیتے پس جب قیام صلوٰۃ میں بھی وی آئی پی تفریق جاری و ساری ہے

جہاں محمود و ایاز ایک ہو جاتے ہیں تو دوسرے مقامات اور دفاتر میں ہمسری کا کلچر کیسے فروغ پا سکتا ہے! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **الصدق ینجی و الکذب یھلک** سچ میں فلاح ہے اور جھوٹ میں تباہی۔ لیکن پاکستانی کلچر کی جب عمارت ہی جھوٹ پر استوار ہوئی ہے' تباہی سے کیسے بچ سکتا ہے قائداعظم کو یہ معلوم نہ تھا کہ میرے مشن کو ایسی مسخ شدہ صورت میں پیش کیا جائے گا جس کی اصلاح ناممکن ہو کر رہے گی یہاں نہ گلیوں' کوچوں میں امن ہو گا نہ شاہراہوں اور پگڈنڈیوں پر نہ گھروں میں نہ عبادت گاہوں میں' بلکہ اب تو نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ نماز عشق بھی سنگینوں کے سائے میں ادا کی جانے لگی ہے مساجد کے دروازے یا تو تالا لگا کر اندر جماعت کی جاتی ہے یا مسلح کمانڈوز کے تعاون سے بارگاہ الٰہی میں جبیں سائی کی جا رہی ہے — ایسے میں یہاں اسلام بھی نافذ ہو گا اور اکیسویں صدی میں داخلہ بھی ممکن۔ یہ عجیب مذاق ہے۔ دفاع کی حالت یہ ہے کہ سال رواں کے بجٹ میں ایٹمی توانائی کے لئے ایک دھیلہ بھی خاص نہیں کیا گیا جس سے شک گزرتا ہے کہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط ہو چکے ہیں۔ بلکہ یہ بھی سنا ہے کہ تین سو کے قریب عالمی نمائندے آکر ہماری تنصیبات کا معائنہ کرنے والے ہیں اگر یہی بات ہے تو معلوم ہوا کہ ہماری قومی غیرت بھی غارت ہو چکی ہے۔ ہم نے ہنود کی رسمی غلامی سے تو نجات پائی تھی مگر یہود کی ظاہری اور باطنی عبودیت قبول کر لی ہے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف

جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں، دستور کے مطابق

(بقرہ،228)

عورت اور مسئلۂ امارت

رحمت اللہ طارق

اسلام میں عورت کی سربراہی کے موضوع پر انقلاب آفریں تحقیق

امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی کے اصول ونظریات کی روشنی میں فقہاً اور محدثین

کے دلائل کا تفصیلی جائزہ لے کر ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی فکر کی تاریخ میں

عورت کی امارت اور سربراہی کبھی قابل اعتراض نہیں رہی

ادارہ ادبیات اسلامیہ، 1339/3 گلشن آباد بیرون پاک گیٹ ملتان

80 صفحات قیمت 20/ روپے

سرسید رح میموریل لائبریری، کالج اسٹاپ جی ٹی روڈ باغبانپورہ لاہور

انبیائے کرام

سماجی ہمسری کا درس دیتے تھے

لیکن زردار نہیں مانتے تھے

رحمت اللہ طارق

انبیاء و رسل اپنے کو عام معاشرے کا ایک فرد سمجھتے تھے اس فرق کے ساتھ کہ ان کے پاس وحی آتی تھی جبکہ عام آدمی اسکا اہل نہیں بنایا گیا تھا لیکن اس اختصاص کے باوصف کوئی دوسرا امتیاز جو مساوات کے منافی ہو انہیں بھی حاصل نہیں تھا۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا ——— تم نوع انسان ہو اور تمہارا پہلا فرد اس مٹی سے پیدا ہوا جس میں پہلے ہی سے جرثومہ حیات رکھ دیا گیا تھا اور مٹی سے پیدا ہونے کی غایت یہ تھی کہ نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا۔ سبھی خاک زاد ہیں یہاں نہ کوئی وضیع (پست طبقے سے) ہے اور نہ شریف (اونچے سے) یہ اونچ نیچ یہ اعلیٰ ادنیٰ کا امتیاز شیطانی سوچ ہے اور شیطان انسان کے اندر مکین ہے اور جب کائناتی قوتوں کو آدم کی اطاعت کا حکم ملا تو عالم خیال ہی میں ان ہی کے ایک فرد نے جو تخریب کا دلدادہ تھا کہا کہ میں "نار" (اونچے عنصر) سے پیدا ہوا اور یہ انسان طین (ادنیٰ عنصر) سے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اعلیٰ کسی ادنیٰ کے حکم پر سر اطاعت خم کردے —— اس طرح یہ تقسیم اللہ نے نہیں انسانوں میں سے جو شیطان صفت تھے انہوں نے پیدا کی اور یہیں سے طبقاتی درجہ بندی متعارف ہوئی پھر رائج ہوتی چلی گئی تاہم ایک زمانے میں اس نے ثقافتی اور سماجی حیثیت بھی اختیار کرلی تھی جس کا فراعنہ کے عہد میں سراغ ملتا ہے یہ اجنبی تھے کسی طرح مصر میں فاتحانہ در آئے اور یہیں کے ہو رہے تاہم اپنے استحکام کے لئے چاہتے تھے کہ اپنی پسند کے اعوان وانصار کے ذریعہ حکمرانی کرتے رہیں قرآن فرماتا ہے۔

> بلاشبہ فرعون (فیملی کے افراد) مصر پر مسلط ہوئے انہوں نے لوگوں
> کو طبقات میں تقسیم کر کے پھر ان ہی میں سے مطلب کے افراد کو

ساتھ ملا کر زیادہ مقرب اور طاقتور بنایا اور پھر ان ہی کے ذریعہ ان ہی کے قوم کے افراد کو ناتواں اور کمزور بنا کر ان کو غلامی کی مار دی اور خواتین کا جوہر حیا غارت کر کے باوقار زندگی بسر کرنے سے محروم کر دیا——

(قصص 4)

اس طرح فرعون بالا دست طبقوں اور مصری اشرافیہ کا نمائندہ قرار پایا بلکہ وحیِ قرآن اشارہ دیتی ہے کہ انسانوں کی اس تقسیم کو فرعون نے ثقافتی درجہ دے کر پاپولر بنانے کی کوشش کی۔ تاکہ زیر دست طبقے اپنا کمتر ہونا ثقافتی طور پر بھی تسلیم کر لیں اور برملا کہہ دیں کہ ہم غریب و ناتواں قانون قدرت کے مطابق بنے ہیں اور برتر طبقے بھی اللہ ہی نے بنائے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ فراعنہ نے اپنی طبقاتی ثقافت کو عام کرنے میں یہاں تک کامیابی حاصل کر لی کہ جب ہارون و موسیٰ علیہما السلام نے اسے مخاطب کیا تو وہ ضرورت سے زیادہ تلملا اٹھا اور کہنے لگا کہ —— یہ دونوں بھائی جن کی قوم (بنی اسرائیل) ہماری غلامی میں پست زندگی بسر کر رہی ہے اور یہ موسیٰ جو ہمارے سامنے وضاحت سے بات بھی نہیں کر سکتا اٹھے ہیں مصری تاج و تخت کو اچھالنے اور خزائن مصر پر قبضہ جمانے۔ لوگو تم ہی بتلاؤ کیا یہ مصر اور نیل کی سرسبز و شاداب زمینیں اور خزانے صرف میرے نہیں (زخرف' 51) قرآن فرماتا ہے کہ فرعون کی تعلّی اور سرکشی یہاں تک بڑھ گئی کہ جب ہم نے ہارون و موسیٰ کو اس جیسے سرکشوں کی طرف بھیجا تو فرعون ہڑبڑایا کہ —— اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ —— یہ کیا حادثہ ہے کہ ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کے انقلابی فلسفہ کو تسلیم کریں جبکہ ان کی قوم ہماری عبودیت (و غلامی) پر راضی ہے (مومنون' 47)

نوح کا درس مساوات۔

تمام انبیاء و رسل جہاں انسانوں کو ڈھیر خداؤں کے آگے سجدہ ریز ہونے سے روک کر خدائے واحد کا تصور اجاگر کرتے تھے ساتھ ہی وحدتِ انسانیت کا درس بھی دیتے تھے کہ ہم نظریہ قوم ہی خود کار حیثیت سے متحد ہو سکتی ہے چنانچہ سیریا' شمالی عراق اور ماضی بعید کی تُرک سرزمین کو حریت اور وحدانیت کے نور سے مستنیر کرنے والے نوح علیہ السلام نے وہاں کی قوموں کو اپنے مشن و مقصد سے جب آگاہ کیا تو وہ بڑا ہی پیچ و تاب کھانے لگیں اور زرداروں نے برملا اپنی حیثیت عرفی کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ ——اَنُؤْمِنُ لَکَ وَاتَّبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ—— کیا تمہاری بات مانیں جب کہ شرفاء میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں رذیل ہی رذیل تمہارے پیروکار ہیں (شعراء' 111) نیز —— وَمَا نَرٰکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیْنَ ھُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ وَ مَا نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ —— ہم یہی دیکھ رہے ہیں کہ تمہارے گرد وہی لوگ جمع ہیں جو معاشرے کے پست ترین لوگ ہیں بھلا تم ہی بتلاؤ تم ہم سے کس بات میں برتری رکھتے ہو؟ (ہود' 27)

اس طرح قوم نوح نے اپنی طبقاتی برتری کے حوالے سے انقلاب نوح کو مسترد کر دیا بلکہ قوم نوح کے حوالے ہی سے طبقاتی تقسیم کی قدامت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ عوام کو لوذل یا اراذل (انتہا درجے کے رذیل) شمار کرتے تھے۔

انقلاب شعیب کی مزاحمت

تمام انبیاء جہاں وحدانیت کا درس دیتے تھے وہاں اخلاقی بلند قدروں کا احیاء بھی کرتے تھے بلکہ طبقاتی کلچر کو انسانی کلچر میں تبدیل کر کے معاشی مساوات کی راہ بھی ہموار کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم سے کہا کہ ناپ تول درست کرو' دولت کمانے کی حرص میں لوگوں کے پاکٹ مارنا چھوڑ دو—— اپنا مال اللہ

کے حکم کے مطابق مستحقوں تک پہنچاؤ ـــ تو زرداروں نے سمجھا کہ یہ شعیب ہمارے وسائل معیشت کو نظر میں رکھے ہوئے ہے یہ چاہتا ہے کہ اپنے معاشی فلسفے کو ہم پر مسلط کر دے دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیئے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے نفع اندوزی سے ہاتھ اٹھالیں اور ان کے نظام معیشت جسے وہ نظام صلوٰۃ سے موسوم فرماتے ہیں اسے تسلیم کر کے اپنا سرمایہ اور پونجی ان کی تحویل میں دے دیں جو کہ ناممکن ہے چنانچہ وہ مل کر بیک آواز کہنے لگے ـــــ یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ـــــ اے شعیب تیرا قانون صلوٰۃ یہی ہے کہ ہم اپنی دولت (خواہ کسی بھی ذریعہ سے حاصل کرلی) تمہارے منشور کے مطابق صرف کردیں اور یہ کہ ان معبودوں کو بھی خیرباد کہیں جنہیں ہمارے آباؤ اجداد قابل عبادت سمجھتے ہیں (ہود' 87) یہاں ابن قتیبہ (859م) اور شریف رضی (1015م) جیسے شناوران لغت عرب نے صلوٰۃ کے معنی قانون کے کئے ہیں۔

اس طرح زرداروں نے اپنی ناجائز دولت کو بھی اپنے ہی محفوظ ہاتھوں میں رکھ کر شعیب کے انقلابی و معیشی قانون کو اس بہانے مسترد کر دیا کہ اسے تم ان ہی کی مرضی کے مطابق خرچ کرنا چاہتے ہو جو دست خالی اور سماجی کمتر حیثیت کے مالک ہیں۔

مسیح کے ماننے والوں کی توہین۔

جناب مسیح علیہ السلام نے یہودی سرمایہ داروں سے جب وعظ کیا تو وہ آپ کی جان کے لاگو ہو گئے اور نہایت حقارت سے کہنے لگے ـــــ کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ صَبِیًّا ـــــ ہم اس کی بات سنیں جو کل تک پنگوڑے کا بچہ تھا؟ ـــ کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ وہ کبھی بھی پنگوڑے کے بچے نہیں رہے تھے۔ یہاں دراصل پنگوڑہ استعارہ ہے کم عمری کا جبکہ کم عمر انقلابی ان کی نظر میں حقیر ہوتا اور ماننے والے نچلی سطح کے شمار ہوتے تھے۔ اس طرح وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ـــ یہ ہوتا کون ہے نہ

اس کا خاندان ہے نہ ماننے والے شرفاء۔ سب حواری یعنی دھوبی' نائی' ترکھان' لوہار' موچی اور تیلی ہیں جن کا معاشرے میں نہ مقام ہے نہ وقار (مریم' 29) یہ حوالہ بھی واضح کرتا ہے کہ سماجی اور معاشی انقلاب کو متعارف کرنے والے زرداروں کی نظر میں خسیس' گھٹیا اور سماجی کمتر شمار ہوتے تھے۔

پیغمبر انسانیتؐ ہم سری کی راہ پر۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم سردار قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپؐ کے دادا عبدالمطلب جہاں مکہ کے بڑے تاجر تھے وہاں حکمران بھی تھے ہمسایوں سے معاہدے کرتے اور سفیروں کا تبادلہ بھی۔ جناب عبدالمطلب کی طرح ان کے بڑے بیٹے عبداللہ بھی تاجر تھے اور حکمران فیملی کے نمایاں فرد۔ آپ تجارتی مال کا قافلہ لے کر شام سے جب مکۃ المکرمۃ آ رہے تھے تو مدینہ منورہ میں آپ کا انتقال ہو گیا جناب عبدالمطلب نے اپنے جانشین بیٹے زبیر کے توسط سے مدینہ منورہ میں ان کے کفن دفن کا انتظام کیا اور تمام اندوختہ و مال مکۃ المکرمۃ منتقل کرا لیا۔ عبد اللہ کی وفات کے دو تین ماہ بعد جب کائنات بشری کے رہبر اعظم صلی اللہ علیہ و سلم کی ولادت باسعادت ہوئی تو عبدالمطلب نے آپ کے مال تجارت کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے نام ہی سے تجارت میں لگا دیا بعد میں یہی مال بڑھتے بڑھتے قابل رشک حد تک مالیت میں تبدیل ہوتا گیا اس طرح 22 سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے آپ بڑے بااصول اور دیانتدار تاجروں میں شمار ہونے لگے تھے اس طرح زمانے کے معیار کے مطابق بھی آپ صلی اللہ علیہ و سلم رئیس زادے تھے یعنی تاجر ابن تاجر اور ابن تاجر تھے بااین ہمہ حریفان باطل شعار کہنے لگے کہ —— **لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ** —— کیا بہتر ہوتا کہ اگر یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی اور بڑے آدمی پر نازل ہوتا (زخرف' 31)

یعنی آپ کو بڑا آدمی ماننے کے باوصف کہتے تھے کہ کوئی اور بڑا صاحب قرآن

ہوتا جو ہمارے پندار کو نہ للکارتا اور پیغام انقلاب نہ سناتا۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کا اصل اعتراض اس بات پر تھا کہ آپ ؐ نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو سماجی کمتروں کی بہبود کے لئے وقف کر رکھا ہے قرآن بتلاتا ہے ایک بار دربار نبوی میں بڑوں کی محفل گرم تھی کہ کوئی سماجی خستہ حال وارد ہوا۔ اس پر سماجی برتروں کے چہروں پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے اور انہوں نے منہ پھیرلیا۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے زرداروں کی بدنصیبی کا نوٹس لیا اور سماجی خستہ حال کی طرف متوجہ ہوئے۔ (عبس 1 تا 4)

طبقاتی سماج کے نقصانات۔

جس معاشرے میں افراد مملکت مساوی سطح کے نہ ہوں وہاں کوئی بھی انقلابی نظام قائم نہیں ہو سکتا بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ نوع بشر جب عہد طفولیت میں تھا تب سے طاقتور اور ناتواں دھڑوں میں بٹ چکا تھا یہ "تیری" اور "میری" کی "وبا" قدیم ہی سے پھوٹ پڑی تھی اس سے حرص و لالچ خون بن کر انسانیت کی شریانوں میں دوڑنے لگا اور بشرزادوں کے دل و دماغ میں تعفن اور فتور پیدا ہوتا گیا۔ طبقاتی کلچر کا راستہ ہموار ہوا اور دنیا اس تباہ کن کلچر کی تباہ کاری سے چیخ اٹھی قرآن نے پوری توانائی سے اس کلچر کو دفنا دیا ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم بذات خود تو یہ احساس دلاتے رہے کہ اسلام میں سب انسان برابر ہیں نہ کوئی برتر ہے نہ کمتر نہ اعلیٰ ہے نہ ادنیٰ' نہ گورے کالے کی بشریت میں امتیاز ہے نہ سرخ و سفید میں فرق——— بایں ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے نام پر "خاندانیت" کے بت تراشے گئے ائمہ اہل بیت نے امت سے شادی بیاہ کو حرام قرار دیا امت کی حسیناؤں کو تو قبول کر لیا گیا مگر امت کے حسینوں کو اپنی بد صورت سیدات کے نکاح کے لئے بھی قبول نہیں کیا حالانکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے ابوالعاص ؓ بن ربیع' حضرت عثمان ؓ اور حضرت علی ؓ کو رشتے دیئے جبکہ ان میں سے کوئی بھی سید نہ تھا اور نہ ہی

غلط شہرت کے مطابق اہل بیت — سیدہ سکینہ (735م) بنت الحسین اپنے زمانے کی بڑی فاضلہ تھیں ادیبہ اور شاعرہ مشہور ہوئیں باتفاق مورخین اپنے دور کی تمام خواتین میں اونچا مقام رکھتی تھیں زمانے کے بڑے بڑے شعراء مثلاً جریر' فرزوق' جمیل اور کثیر(Kusyyar) آپ کی سخا سے ہزار ہزار درہم ماہانہ وظیفہ یاب تھے۔ خلیفہ ہشام سے پورے طنطنہ اور وقار سے امام حسین علیہ السلام کی دستار' پھاوڑے اور خود کا مطالبہ کیا جسے خلیفہ نے باادب اور احترام سپرد بھی کیا اور لاکھوں کے وظائف بھی دیئے اتنے امتیازات کے باوصف آپ نے سات شادیاں کیں مصعب بن زبیر' عبداللہ بن عثمان' حضرت عثمان کے پوتے زید بن عمرو بن عثمان و چار دیگر اور یہ سب کے سب غیر سید تھے — کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سماجی برتری نے یہاں زک تو اٹھائی مگر سنبھل گئی بعد میں عنصری برتری بھی اس سے آن ملی۔ اب تنہا طبقاتی ہی نہیں عنصری کلچر بھی پوری شدت سے فروغ پانے لگا۔ پہلے امام جعفر کے توسط سے سید کلچرڈ قرار پائے پھر ان کی دیکھا دیکھی مغل' مرزا' بخارنی' گردیزی' حسنی و حسینی' قریشی' گیلانی وغیرہ بھی عنصری کینسر میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔ ایک جگہ سماجی برتری کے ضمن میں قرآن پاک زرداروں کی نفسیات سے پردہ اٹھاتے ہوئے واضح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کے پیغمبر نے جب ان سے کہا کہ آئندہ تم نے طالوت کی قیادت میں کام کرنا ہے تو ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ — وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ —— وہ تو غریب طبقے سے تعلق رکھتا ہے اس کے پاس نہ مال ہے نہ کشائش رزق۔ اسکی قیادت میں کام کریں تو کیسے کریں؟ (البقرہ' 247)

عنصری کلچر کا کینسر۔

طبقاتی اونچ نیچ جس طرح نوح علیہ السلام کے زمانے میں پوری آب و تاب سے موجود تھی آج بھی پوری توانائی سے فروغ پذیر ہے بلکہ جو مسلمان اٹھے تھے کہ دنیا سے اعلیٰ و ادنیٰ کی خرابیوں کو مٹا دیں گے بعد میں وہ بھی اس میں یہاں تک دھنستے

چلے گئے کہ انہیں اپنی تباہی کا احساس تک نہ ہوا اس پر ان کی یہ خامکاری مستزاد کہ یہ لوگ عنصری برتری کے کافرانہ کلچر کو اپنا کر پوتر ملیچھ کے دھڑوں میں بھی بٹتے چلے گئے اب یہ بھی سیدوں کی طرح امتیوں کو رشتے دینا حرام سمجھتے اور بسا اوقات نکاح تڑوانے کی جسارت بھی کر بیٹھتے ہیں بلکہ قرآن محکم نے اپنے منصفانہ انداز عدل میں عنصری تفوق کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے قصاص کا قانون عطا فرمایا۔ قصاص کے ایک معنی حدود میں یکسانی پیدا کرنے کے ہیں لیکن بعد میں ہمارے عنصری مریضوں نے اس کو اتنا مسخ کر دیا کہ وہ عدالتی امور پر بھی اثر انداز ہونے لگا۔ ملاحظہ فرمائیے مسلم قانون سازوں کا دیا کھیان۔

جمہور مسلمانوں کا مذہب ہے کہ مسلمان قاتل کو غیر مسلم مقتول کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ (تفسیر نیل المرام طبع مصر ص 14 سطر 16) یہاں کفر و اسلام کی اساس پر غیر مسلم کے شہری حقوق پامال کر کے عنصری کلچر کا احساس دلایا گیا ہے دوسرے الفاظ میں قرآن کے نظریہ قصاص کو مسترد کر دیا گیا ہے۔ آگے چلئے۔

آقا نے اگر غلام کو قتل کیا تو قصاص نہیں ہے البتہ خون بہا ہے لیکن وہ بھی آقا کے نصف کے برابر لیکن غلام اگر آقا کو قتل کر دے تو قصاص ہے یا مکمل خون بہا۔ البتہ ابو حنیفہ' سفیان' ثوری' ابن ابی لیلی اور داؤد ظاہری یہ گنجائش رکھتے ہیں کہ اگر کسی دوسرے آقا نے کسی کے غلام کو قتل کر دیا تو اسے ہی قصاص میں مارا جائے۔
(نیل المرام ص 16 سطر 16 تا 17)

یہاں آقا اور غلام دونوں ہی مسلمان ہیں کفر یا اسلام اساس فیصلہ نہیں بااین ہمہ عنصری برتری کو معیار بنا کر دو مسلمانوں کے مابین حدود و تعزیرات میں امتیاز روا رکھا گیا ہے جس سے نظریہ قصاص کی کھلی تکذیب ہوتی ہے نیز ارشاد ہے — بیوی اگر میاں کو قتل کر دے تو قصاص ہے یا پھر مکمل خون بہا۔ لیکن اگر میاں ہی بیوی کو قتل کر دے تو قصاص بالکل نہیں ہے اور جو خون بہا ہے تو وہ بھی نصف یعنی خوں بہا اگر 5 لاکھ ہے تو مرد مقتول کے لئے 5 لاکھ ہی رہے گا۔ لیکن مقتولہ کے لئے دو لاکھ پچاس ہزار (نیل المرام صفحہ 16/17 تا 18)

یعنی مرد چونکہ جنس اعلیٰ ہے لہٰذا اس کا قصاص بھی ہے۔ اور خون بہا بھی مکمل اور عورت چونکہ جنس ادنیٰ ہے لہٰذا اس کا قصاص تو سرے سے ہی نہیں اور جو دیت (خون بہا) ہے وہ بھی مرد کی دیت کے نصف کے برابر۔

اسلام بھی گوسالہ عنصریت کی بھینٹ چڑھ گیا۔

اہل بیت کی فضیلت کے نام پر جس عنصریت کو جنم دیا گیا اس نے آگے چل کر وحی کی عطا کردہ روشن اقدار کو بے نور بنا کر بلکہ روح قرآن کو مسل کر رکھ دیا امت میں ملیچھ اور پوتر' اعلیٰ ذات ادنیٰ ذات' گوتوں اور خاندانوں کا تصور کیا ابھرا کہ پورے اسلام کی چولیں ہی ڈھیلی پڑ گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اخوت و مساوات کا جو رشتہ جوڑا تھا وہ ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا محترم مودودی صاحب نے عنصری برتری کو نسلی تعصب کے جواز میں استعمال کر ڈالا۔ بلکہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ تک اسے حقیقت سمجھنے لگے ادھر کاظمیوں' زیدیوں اور نقویوں کی نسلی یلغار نے ہر دل میں امنگ پیدا کر لی کہ وہ ذات بدلے اور اونچے طبقوں میں شامل ہو جبکہ وحی قرآن کی رو سے ذات کی تبدیلی نہ صرف اخلاقی جرم ہے بلکہ سنگین نوعیت کا گناہ بھی ہے بلکہ تبدیلی ذات کے وطیرے کو گھناؤنی روسیاہی سے تعبیر کر کے حرام کاری اور حرام خوری کے خانے میں رکھ دیا فرمایا —— وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ —— اے پیغمبر ذیل کے لوگوں کی بات نہ مانو۔ جو قسمیں کھا کر بات کریں۔ جو پست کردار ہوں۔ جو گھٹیا قسم کے عیب لگانے والے ہوں۔ چغل خور ہوں۔ رفاہی اور اصلاحی کاموں میں روڑے اٹکانے والے ہوں۔ حد سے زیادہ ظلم روا رکھنے والے ہوں۔ جھگڑالو ہوں۔ اور اس لئے قوم اور ذات بدلنے والے ہوں کہ اونچے لوگوں میں رشتے ناطے کر کے مال و دولت بھی سمیٹ لیں اور خوشحال نسل بھی پیدا کریں (القلم 10 تا 13)

یہاں قرآن پاک نے اونچی ذات کا نظریہ ہی مسترد کر دیا اور واضح فرما دیا ہے کہ

جو صاحب اپنی معمول کی ذات کو غیر معمولی گوت میں تبدیل کرنے کے مرتکب ہوں ان کی گواہی اسی طرح مسترد ہے جس طرح کسی مشتبہ اور نامعلوم النسب کی گواہی ناقابل قبول ہے بلکہ "لَا تُقْبَلُ" کے صیغہ میں جہاں گواہی کا مسترد ہونا جھلکتا ہے وہاں معاشی بائیکاٹ کا اشارہ بھی ملتا ہے۔

یہ عنصری برتری اور اس بناء پر تبدیلی ذات کی وبا پست اقوام میں بڑی سرعت سے رواج پا گئی اور قرآن کے بقول بہترین معاشی سہارا ثابت ہو گئی کہ وہ ایک شہر سے نکل کر دوسرے میں پہنچتے ہی سید بن جاتے اور پھر آسانی سے عقیدت و احترام کے اونچے مناصب پر فائز ہو کر حسن و شباب کے مزے بھی لوٹتے اور دھن و دولت کے مالک بھی بن جاتے اکثر لوگ جو احساس کمتری کا شکار ہو کر اپنے کو ڈوم' میراثی' کرخندار اور بھانڈ تصور کرتے تھے دوسرے شہروں میں پہنچ کر پوری صفائی سے کاظمی' زیدی' نقوی' گیلانی' قریشی اور بخاری بنتے چلے گئے۔ لیکن بظاہر ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرنے کے باوجود نامعلوم اور مشتبہ النسب کی سطح کے رہیں گے یہ اللہ کا فیصلہ ہے قرآن کی ذاتی وضاحت ہے جعلی نسب اگر معلوم ہو تو ایسا شخص نہ جائیداد کا وارث بن سکتا ہے نہ ہی اس کی گواہی کی پذیرائی ہو سکتی ہے وہ معاشرے کا بدترین فرد شمار ہو گا — غرضیکہ عنصری برتری کوئی انسانیت کا معیار نہیں ہے۔ اس سے ذاتی مفادات کی بھرپور تکمیل تو ہو سکتی ہے اسلامی مشن و مقاصد اخوت' مساوات اور ہمسری کی بنیادیں اکھڑ جاتی ہیں۔

انقلاب ہی ناہموار سماج کو بدل سکتا ہے۔

معاشرہ جب انسانی قدروں سے بیگانہ ہو کر خود ساختہ معیارات شرافت ایجاد کرتا اور وسائل معیشت کو اپنی ذات میں مرتکز کر کے خلق خدا کو اپنی مطیع و فرماں بردار بننے پر مجبور کر دیتا ہے تو ایک مرحلہ پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ نفرت کا کلچر ابھرنا شروع ہو جاتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے تو اللہ اپنے بندوں کے دلوں میں انقلاب اور

تبدیلی کی لہر پیدا کر دیتے ہیں جس سے یہ ہوتا ہے کہ زیر دستوں کی آقائی کے آثار نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بڑے بڑے لوگ جو پہاڑوں کی طرح قد آور اور مضبوط بنیادوں پر کھڑے نظر آتے ہیں بے حیثیت تنکوں کی طرح اڑتے دکھائی دیں گے قرآن اس مبارک تقریب کی منظر کشی فرماتا ہے کہ ——

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّىْ نَسْفًا ○ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا○ لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَا اَمْتًا○ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِىَ لَا عِوَجَ لَهٗ وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا○

یہ لوگ آپ سے بڑے لوگوں کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ ان کا کیا ہو گا؟ تو انہیں بتلا دیجئے کہ میرا رب ان کی توانائی کو ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں اچھال دے گا تب دیکھو گے کہ سرزمین ذہن صاف و ہموار میدان کی طرح ہو گی نہ کہیں کجی ہو گی نہ اونچ نیچ۔ سب لوگ انقلاب کی صدا بلند کرنے والے کی طرف لپکیں گے اس صدا کار کے مزاج میں نہ کجی ہو گی نہ خیانت۔ یہ صدا الٰہی بلند ہو گی جس کے آگے اونچی آواز نہ اٹھے گی کوئی مخالف صدا بلند نہ ہو گی مگر قدموں کی چاپ۔

(طٰہٰ' 105 تا 108)

اور اس نوعیت کا انقلاب ایک بار نہیں آیا لاکھوں بار آیا اور کروڑوں بار آتا رہے گا۔ ہر کلاس کا انسان جب تک ہمسری کی ایک ہی سطح پر نہیں آتا اس طرح کے انقلابات سے نہیں بچ سکتا خاص کر تخریبی عناصر کے سرغنے جو اپنے کو کوہ وقار سمجھتے اور تاجدار بنے پھرتے تھے ان کے تاج اچھالے جاتے رہیں گے پاؤں میں بیڑیاں اور گردن میں زنجیر ڈال کر انہیں گھسیٹا جاتا رہے گا تب ان کا ہر فرد کہے گا ہائے افسوس میں کیسی مصیبت میں پکڑا گیا کہ نہ مال و دولت کام آئے نہ جاہ و حشم سب کیا دھرا غارت ہو گیا— تب انقلاب کا فیصلہ مکرر ہو گا کہ —— خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ○ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ○ ثُمَّ فِىْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ○ —— اسے پکڑو اور زنجیروں میں جکڑے رکھو پھر تباہی کی جہنم میں دھکیل دو بلکہ وہاں بھی اسے ستر ستر (یعنی زیادہ لمبے) زنجیروں میں جکڑ کر پابہ جولاں چلاتے رہو (الحاقہ 30 تا 32)

پھر ان سماجی برتروں کی وجہ گناہ بتلائی کہ ـــــ اِنَّہٗ کَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ ○ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ○ ـــــ یہ ناہنجار نہ تو اللہ کے قانون (معیشت) کو مانتا تھا اور نہ ہی کمزور کے معاش کی سوچتا تھا (الحاقہ 33 تا 34)

پیغمبر انسانیت کا وطیرہ کیا تھا ؟

کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم خود بھی قبیلہ کے سردار عبدالمطلب کے پوتے اور مکہ کے تاجر عبد اللہ کے نور العین تھے بلکہ تاجر ابن تاجر اور ابن تاجر تھے اس طرح اپنے تایا زبیر بن عبدالمطلب کے عہد تک بالواسطہ ابن سردار اور ابن سردار بھی تھے اور بعد میں مستقل طور پر سالار امم بنے اسی طرح آپؐ کے جاں نثار ساتھی ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم بھی تاجر اور حاکم تھے۔ ان کے پاس دولت بھی تھی اور وسائل بھی یعنی کہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے اب اسلام میں اگر بالائی طبقات کا تصور نہ ہوتا تو یہ حضرات کیونکر قیادت اقوام پر فائز ہو سکتے تھے۔

جی بجا فرمایا آپ نے لیکن اللہ کے رسولؐ ہوں یا رسولؐ کے جاں نثار ساتھی، ان سب نے اپنے کو ڈی کلاس بنا رکھا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم جب دربار لگا کر تشریف فرما ہوتے تو باہر سے آنے والے کو دریافت کرنا پڑتا کہ تم میں محمدؐ کون ہیں؟ جب نشاندہی ہوتی تو مارے ہیبت کے اسکا رواں رواں کانپ جاتا۔ اسی طرح ابو بکرؓ اپنا تمام اندوختہ ملت کے سپرد کر کے صرف گذر بسر جتنی تنخواہ پر اکتفا کر بیٹھے تھے۔ فاروق اعظمؓ کا تو یہ حال ہے کہ آٹے کی بوریاں کاندھوں پر اٹھا کر گھروں تک پہنچاتے اور جب بیت المقدس میں فاتحانہ در آئے تو شہر میں داخل ہوتے وقت اونٹ کی مہار آپ ہی تھامے ہوئے تھے کہ اب سوار ہونے کی نوبت ملازم کی تھی۔

خلیفہ اونٹ کی پکڑے ہوئے مہار آئے
حضور دوش مساوات پر سوار آئے

جہاں تک حضرت عثمانؓ کی بات ہے تو ان کے ایثار و قربانی اور خدمت اسلام کے واقعات — تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ رہے حضرت علیؓ تو آپ پیدائشی ڈی کلاس تھے بلکہ ابو طالب نہایت مسکین اور قوت لایموت کے مالک بھی نہیں تھے۔ اس طرح نبی اکرم اور خلفائے ثلاثہ سماجی برتری کے باوصف اپنے کو ڈی کلاس میں شامل کر گئے تھے تو اس کے بعد ایثار و قربانی کی کون سی سٹیج ہے جو وہ اختیار کر پاتے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم و القوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا

پس اگر وہ تم سے (اور تمہارے دین سے) کنارہ کش ہو گئے، پرامن رہے اور صلح وسلامتی کا پیغام بھی بھیج بیٹھے تو پھر خدا نے تمہارے لئے گنجائش نہیں رکھی کہ تم انہیں چھیڑو۔۔۔نساء 90

قتل مرتد کی شرعی حیثیت

رحمت اللہ طارق

(تحقیق اور ریسرچ کا بے نظیر مرقع)

قرآن کی عطا کردہ حریت فکر کی روشنی میں احادیث وآثار کا بے لاگ جائزہ

اسلام میں قتل مرتد کے موضوع پر انقلاب آفرین تحقیق

جس میں

فقہا اور محدثین کے دلائل کا تفصیلی جائزہ لے کر ثابت کیا گیا ہے کہ

پرامن ارتداد کبھی بھی قابل تعزیر نہیں رہا

سرسیدؒ میموریل لائبریری، جی ٹی روڈ، باغبانپورہ، لاہور

جاگیرداری سماج

کو

پہلا رگڑا

رحمت اللہ طارق

خالق ارض وسما نے جب انسانوں کو ارضی نظام درست کرنے کی ذمہ داری سونپی — تو اس نظام کو چلانے کی پالیسی یہ عطا فرمائی کہ — اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ — حکمرانی صرف اللہ کا حق ہے (القرآن) —- یہ نہ موروثی ہے نہ جانشینی کے روایتی طریقوں سے اسے چلایا جا سکتا ہے کہ اللہ کا نہ کوئی وارث ہے نہ جانشین۔ چنانچہ تمام انبیاء نے اللہ کے حق حکمرانی کا احسن طریق سے پاس کیا اور آخر میں یہ ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کی گئی چنانچہ مسلمانوں کے زیرک اور دانش و بصیرت کے اعلےٰ مقام پر فائز —— سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (644م) جب مسلمانوں کے نمائندہ قرار پائے تو اس ربانی پالیسی کو رہنما بناتے ہوئے اعلان کر دیا کہ — حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ — ہمیں اللہ کی عطا کردہ پالیسی یعنے قرآن کافی ہے — چنانچہ اس پالیسی کو اپناتے ہوئے حدیث و روایات کی تدوین اور باب بندی کو ممنوع اور قابل سزا جرم ٹھیرا دیا کہ اس کے بغیر کتاب اللہ کو سپریم لاء نہیں بنایا جا سکتا تھا —— ایک اور مسئلہ جسے بعض اہل روایات نے بلا وجہ الجھا دیا ہے وہ مسئلہ ہے ملکیت زمین کا۔ جسکی بابت قرآن کی پالیسی واضح ہے اور یوں تو قرآن پاک کی ہر آیت دامن خیال کو پکڑ کر روک لیتی ہے کہ رک جاؤ اور مجھے غور سے دیکھو لیکن خصوصاً سورہ رحمان کی دسویں آیت — وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ — نے دامن فاروق کو بزور کھینچ کر اپنی طرف متوجہ کیا وہ دل کش بھی تھا جذب و کشش کا مثالی کرشمہ بھی — فاروق اعظمؓ نے جب رک کر غور سے دیکھا تو اس کی گہرائیوں میں اتر گئے اور آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ اس آیت نے تو — زمین کو سرچشمہ زیست و معیشت قرار دے کر زمین کی نجی ملکیت کا پتہ ہی کاٹ دیا ہے چنانچہ آپ نے فیصلہ کیا کہ جونہی موقع میسر آئے گا اس حقیقت کو عملی جامہ پہنائیں گے چنانچہ قدرت نے آپ کے عہد

مبارک ہی میں دجلہ' فرات اور نیل کے سرسبز علاقوں تک رسائی ممکن بنا دی اور دنیا کو یہ خوشخبری مل گئی کہ زرعی املاک پر تمام بنی نوع بشر کا مشترکہ حق ہے۔ قاضی ابو یوسف ( ) ابو عبید بن قاسم بن سلام (838م) اور یحییٰ بن آدم (818م) نے اپنے اپنے مالیاتی مجموعوں میں لکھا ہے کہ:

عراق جب اسلامی عملداری کا حصہ بن گیا تو خلیفہ رسول عمر فاروقؓ نے فاتح اور عراق کے گورنر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص (675م) کے نام ایک سرکلر جاری کیا جس میں تھا کہ تم نے اپنے خط میں فتح عراق کے سلسلہ میں ہاتھ آئے مال کی تقسیم کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ اس کا جواب سن لو کہ — فوج نے مال غنیمت کی جن اقسام کو حاصل کر لیا ہے وہ اگر جائداد منقولہ کی نوعیت کی ہیں تو انھیں حاضر مسلمانوں میں بانٹ دیجئے۔ (**فاقسما بین من حضر من المسلمین**) اور جو جائداد غیر منقولہ ہے اسے بغیر بانٹے (سرکاری تحویل میں رکھئے) یعنی زمینوں اور نہروں پر اصل قابضین سے معاملہ کر کے ان ہی سے کاشت کا کام لیا جائے (**واترک الارضین والانہار لعمالها** — کیونکہ زمینیں اور نہریں آنے والوں کی مشترکہ میراث ہیں انھیں اگر آج کے موجودہ افراد کے مابین تقسیم کر دیا جائے تو آنے والوں کے لئے کچھ بھی نہ بچے گا (کتاب الخراج ابو یوسف صفحہ 14 — کتاب الاموال طبع اول صفحہ 59 — اور کتاب الخراج یحییٰ بن آدم بن القرشی طبع مصر 1347 ہجری صفحہ 27 و صفحہ 28 و صفحہ 48 حدیث نمبر 49 صفحہ 121)

یہ تنہا فاروق اعظم کی رائے ہی نہیں تھی اس کے لئے آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ بھی کیا تھا بلکہ ان کا امتحان لینے کے لئے اپنی منفی رائے کا اشارہ بھی دیا۔ بایں ہمہ حضرت علیؓ اور معاذ بن جبلؓ نے جن الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا وہ صدائے عمر ہی کی بازگشت تھی مثلاً حضرت معاذؓ (639م) فرماتے ہیں:

اے خلیفہ رسول' آپ اگر علاقہ جابیہ کی زمین فاتح مسلمانوں میں بانٹ دیں گے تو بخدا اس کے نتیجہ میں جو صورت حال نمودار ہو گی وہ آپ کو یقیناً ناگوار گذرے گی (**و اللہ انہ لیکونن ماتکرہ**) کیونکہ آپ نے اگر اس سرسبز و شاداب

علاقے کو لوگوں کی نجی ملکیت بنا ڈالا اور مالکانہ حیثیت سے وہ اس پر قابض چلے آئے تو ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کوئی ایک مرد یا کوئی ایک عورت تن تنہا اتنے رقبوں کے مالک بن بیٹھیں گے — اس کے بعد ایسی قوم بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ جو اسلام کو حاجت روا سمجھ کر مسلمان ہو جاتی ہے مگر مسلمان بنتے ہی کاشتکار معاشرے میں اس کے لئے ایک مرلہ بھی نہیں بچتا تب وہ کھائے گی کہاں سے؟ **(وھم لا یجدون شیئا)** لہٰذا آپ علاقہ جابیہ کو نجی ملکیت بنانے پر نظر ثانی کر کے ایسا عادلانہ فیصلہ فرما دیں جو موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے یکساں مفید ہو **(فانظر امرا یسع اولہم و آخرھم** — (الاموال طبع اول قاہرہ صفحہ 59' صفحہ 60 سطر 7 تا 9)

غور فرمائیے خلیفہ رسول اور اصحاب رسول کی معاشی سوچ میں کتنی ہم آہنگی اور مفاد عامہ کے لئے کتنا ہمدردانہ شعور پایا جاتا تھا؟ ادھر شوریٰ کے ایک ممبر سفیانؓ بن سعید بھی علیؓ اور معاذؓ کی رائے رکھتے اور زمین کو غیر منقولہ جائیداد کہہ کر مجاہدین میں تقسیم کرنے کے مخالف تھے (الاموال صفحہ 60 سطر 10)

اسی طرح مصر کے فاتح حضرت عمروؓ بن العاص (664م) نے حضرت زبیر کے مطالبہ تقسیم کر روک کر دارالخلافہ سے دریافت کیا تو ادھر سے جواب موصول ہوا کہ — نیل کے سرسبز و شاداب علاقے کو زبیر اور دیگر فوجیوں کے مطالبہ پر ہرگز تقسیم نہ کریں — مفتوحہ علاقے بیت المال یعنے انسانوں کی مشترکہ وراثت ہیں (نہ فروخت ہوں گے اور نہ تقسیم' نہ ہبہ نہ تملیک اور نہ توریث)۔ (الاموال صفحہ 58 حدیث نمبر 144) — چنانچہ عمرو بن العاص نے حضرت زبیر و دیگر فاتحین کو بلوا کر — مرکز کی پالیسی اور ہدایات سے آگاہ کر دیا۔

ادھر عراق ہی میں ایسا بھی ہوا کہ نومسلموں میں اکثریت **بجیلہ** (Bujaila) قبیلہ پر مشتمل تھی گذارہ یونٹ کی حد تک کچھ زمینیں حاصل کر رکھی تھیں اس کے بعد یہ ہوا کہ

عمار بن یاسر (652م) اور جریر بن عبداللہ بجلی پر مشتمل ایک وفد عازم مدینہ ہوا اور جب دربار خلافت میں حاضری ہوئی تو فاروق اعظمؓ نے قبیلہ کے سردار جریر

سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا کہ — **لو لا انی قاسم مسئول لکنتم علی ما جعل لکم** (اگر میری بحیثیت قاسم (تقسیم کنندہ) کے نازک پوزیشن نہ ہوتی تو جس طرح تم زمینیں حاصل کر بیٹھے ہو میں کچھ نہ کہتا مگر میری مسئولیت — اللہ اور مسلمانوں کے سامنے جوابدہی کا تقاضہ ہے کہ میں آپ کے قبیلہ کو عطا کردہ زمینوں پر نظر ثانی کروں اور نظر ثانی کرتے وقت میرے سامنے یہ بات رہی کہ — **اریٰ الناس قد کثروا** — میں دیکھ رہا ہوں کہ آبادی بڑھ رہی ہے لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے قبیلہ کی حاصل کردہ اراضی واپس لے کر بیت المال کی تحویل میں دے دوں — **فاریٰ ان تردہ علیھم** — لہٰذا میرا فیصلہ ہے کہ تم قبیلہ کے سردار کی حیثیت سے تمام زمینیں لوٹا دو اور ہم تمہارا دل رکھنے کے لئے فی حصہ سونے کے اسی دینار معاوضہ فراہم کئے دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت جریر (672م) راضی ہو گئے — (الاموال طبع مصر صفحہ 61 سطر 17 تا 19۔ کتاب الخراج ابو یوسف صفحہ 31)

اسی قبیلہ کی "ام کرز" نامی عورت عراق سے چل کر مدینہ منورہ پہنچی اور حضرت عمر کے پاس نالش کناں ہوئی کہ حضرت والا نے ہمارے قبیلے کی تمام زمینیں معاوضے پر حاصل کر لی ہیں۔ لیکن مجھے معاوضہ نہیں ملا جبکہ میرے مرحوم والد کی شہادت ریکارڈ پر موجود ہے اور حصہ بھی طے ہے (**وسھمہ ثابت**) فاروق اعظم نے فرمایا — اے **ام کرز** — ہم نے سب کو معاوضہ دے کر فارغ کر دیا ہے اب یہ تیری قوم کے ذمہ ہے کہ تمہارا حصہ فراہم کرے — **ام کرز** نے کہا میری قوم نے جو کچھ کیا سو کیا میں نے کچھ بھی وصول نہیں کیا ہے — **ان کانوا قد صنعوا فانی لست اسلم** — اب تاوقتیکہ کہ مجھے ایک اونٹنی جس پر سرخ نمدہ (**جل**) ہو اس پر بٹھا کر میری مٹھی میں سونے کی صورت میں معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا میں ٹلنے کا نام نہیں لوں گی۔ **و تملا کفی ذھبا** — چنانچہ اسے دوبارہ سونے کے اسی دیناد دے کر واپس بھیج دیا گیا — (الاموال صفحہ 61 حدیث 155 و صفحہ 62 سطر 3)

یہ واقعات لکھ کر ابو عبیدہ تبصرہ فرماتے ہیں کہ **اراد ان یکون موقوفا علی المسلمین ماتنا سلوا یرثہ قرن عن قرن فتکون قوۃ لھم علی عدوھم** — میرا

خیال ہے فاروق اعظم نے متروکہ جائیداد میں زمین کو شامل نہ کر کے زبردست بصیرت کا ثبوت دیا ہے کہ زمین جو سرچشمہ زیست ہے اسے نسلاً بعد نسلٍ آنے والوں کے لئے مشترکہ میراث بنانا اس لئے بھی صحیح تھا کہ آنے والی نسلیں قرنہا قرن تک فکر معاش سے بے نیاز ہوں ان کی غذائی پوزیشن مستحکم رہے اور دشمن ہمیشہ ناتواں رہیں۔ (الاموال صفحہ 18/82 تا 19)

مدینہ منورہ سے دس بارہ کلو میٹر یا اس سے زیادہ فاصلے پر "مزنی" (Muzany) قبائل کی دس بارہ بستیاں ہیں جنھیں کاشت کاری کے اصولوں کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم برائے کاشت دینا چاہتے تھے لیکن امیدوار زیادہ تھے نیز شرط یہ تھی کہ امیدوار مزنی قبیلہ سے ہو کیونکہ رسول اللہ پنجابی پیغمبر نہیں تھے لہٰذا پرائے علاقے میں کسی غیر حاضر زمیندار کو بسانا نہیں چاہتے تھے کہ مبادا مقامی لوگ اسے قبول نہ کریں اور آئے دن خواہ بارانی پانی ہی پر لڑتے جھگڑتے رہیں۔ چنانچہ عظیم مورخ یحیٰی بن آدم (818م) اپنی شہرہ آفاق کتاب "الخراج" میں لکھتے ہیں

عن عبدالله بن ابی بکر قال جاء بلال بن الحارث المزنی الی رسول الله صلی الله علیه و سلم فاستقطعهٗ ارضا فاقطعها له طویلةً و عریضةً فلما ولی عمر قال له یا بلال انک استقطعت رسول الله صلی الله علیه وسلم ارضا طویلةً و عریضةً فقطعها لک و کان رسول الله صلی الله علیه وسلم لم یکن یمنع شیئا یسئاله و انت لا تطیق ما فی یدیک فقال اجل۔ فقال فانظر ما قویت منها فامسکه مالم تطق و مالم تقو علیه فارفعه الینا نقسمهٗ بین المسلمین فقال لا افعل و الله اقطعنیه رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال عمر والله لتفعلن فاخذ منه ما عجز عن عمارته فقسمه بین المسلمین۔

ابوبکر صدیقؓ کے فرزند حضرت عبداللہ اس روایت کے راوی کی حیثیت سے بیان کرتے ہیں کہ مزنی قبیلہ کے بلال بن حارث مزنی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کاشت کے

لیے زمین کے ایک رقبہ کا سوال کیا جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے لمبا چوڑا ایک رقبہ عطا فرمایا — اب جس وقت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالٰی عنہ کا دور آیا تو بلال کو بلا کر اس سے یوں مخاطب ہوئے کہ

ابن خطاب: اے بلال تمہیں معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ و سلم خلق عظیم کے مالک تھے جو چیز آپ کے پاس ہوتی اسکے سائل کا سوال رد نہیں فرماتے تھے جیسے کہ تم نے بھی کاشت کے لیے آپؐ سے لمبے چوڑے قطعہ اراضی کا سوال کیا اور آپؐ نے اسے پورا کر دیا۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ ایسا ہوا؟

بلال: حقیقت ہے۔

ابن خطاب: تو کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ زمین کی مقدار جتنی تم نے حاصل کی ہے وہ تمہاری بساط اور قوت کاشت سے زیادہ ہے

بلال: ہاں یہ بھی حقیقت ہے (**فقال اجل**)

ابن خطاب: تو پھر دیکھو تم جتنی زمین آباد کر سکو اتنی ہی رکھ لو اور جتنی تمہاری قوت کار سے زیادہ ہے اسے دیگر مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے لیے ہمارے سپرد کردو۔

بلال: اے ابن خطاب ایسا نہیں ہو سکتا بخدا یہ قطعہ زمین مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے عطا فرمایا تھا۔ یہ ہرگز واپس نہ ہو سکے گا۔

ابن خطاب: بخدا زمین کی جس زائد مقدار کو تم آباد کرنے سے عاجز ہو وہ واپس ہو کر رہے گی۔

اس کے بعد راوی کا بیان ہے کہ بلال کی زائد زمین کو دیگر لوگوں میں تقسیم کرنے کے نام پر ابن خطاب نے ضبط کر ڈالا (**فاخذ منه**) اور کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا —— **کتاب الخراج** یحیی بن آدم طبع سلفیہ مصر صفحہ 93 سطر 2 تا 10 — نیز **کنزالعمال طبع دائرة المعارف النظامیه** دکن 1312 ہجری جلد 91/2 —

بیہقی طبع دائرہ المعارف دکن جلد 31/138/6 صفحہ 149 سطر 11)

کتاب الاموال میں ابو عبید قاسم بن سلام (838م) نے اس روایت کی ذیل میں لکھا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے مذکورہ رقبہ کسی غیر حاضر زمیندار کو کسی ممکنہ شر و فساد کا انسداد کرنے کی وجہ سے عطا نہیں فرمایا اور شرط یہ رکھی کہ آباد کار اگر کسی رقبے کو تین سال تک آباد نہیں کر سکتا تو وہ قابل ضبطی ہے۔ اس طرح یہ حدیث بھی واضح کرتی ہے کہ زمین مفتوحہ ہو یا افتادہ ذاتی ملکیت نہیں بن سکتی وہ قومی تحویل میں رہے گی قابض نہ بیچ سکتا ہے نہ ہبہ' تملیک اور ورثہ بنا سکتا ہے فرمایا — هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا — زمین اور جو کچھ اسمیں اللہ نے پیدا کیا ہے وہ تم سب کے لئے ہے۔ (بقرہ' 29)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زمینداری، جاگیر داری

اور

اسلام

رحمت اللہ طارق

(نیا اضافہ شدہ ایڈیشن عنقریب دستیاب ہوگا)

سر سیدؒ میموریل لائبریری، باغبانپورہ لاہور

قرآنی انصاف کی تلاش

رحمت اللہ طارق

خالق ارض و سما نے جب انسانوں کو ارضی نظام درست کرنے کی ذمہ داری سونپی تو اس نظام کو چلانے کی پالیسی عطا ہوئی کہ —— اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ حکمرانی صرف اللہ کا حق ہے (القرآن) اور اس کا سب سے بڑا حکم یہ ہے کہ —— اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ —— حکمرانی میں انصاف کا چلن عام ہو (نساء:58) کہ یہ حکمرانی نہ موروثی ہے اور نہ جانشینی کے روایتی طریقوں سے اسے چلایا جا سکتا ہے۔ کہ اللہ کا نہ کوئی وارث ہے اور نہ کوئی جانشین۔ چنانچہ تمام انبیاء نے اللہ کے حق حکمرانی کا احسن طریق سے پاس کیا اور آخر میں یہ ذمہ داری مسلمانوں کے ناتواں شانوں پر ڈال دی گئی۔ چنانچہ مسلمانوں کے زیرک اور دانش قرآن کے اعلیٰ مقام پر فائز سیدنا عمر فاروق ؓ (644م) جب مسلمانوں کے نمائندہ قرار پائے تو اس ربانی پالیسی کو اپناتے ہوئے اعلان کر دیا کہ حسبنا کتاب اللہ یعنی اللہ نے جو پالیسی قرآن کے ذریعہ عطا کی ہے' وہ ہمارے لئے کافی ہے۔ چنانچہ اس پالیسی کو عملاً برقرار رکھتے ہوئے حدیث و روایات کی تدوین اور باب بندی کو ممنوع اور قابل تعزیر جرم ٹھہرا دیا کہ اس کے بغیر قرآن کی آئینی انفرادیت نکھر نہ سکتی تھی اور نہ ہی اس کے سپریم لاء بننے کا پتا چل سکتا تھا۔ مثال کے طور پر مفتوحہ علاقوں کی متروکہ املاک کو حاضر فوجیوں میں تقسیم کا مسئلہ ہے۔ دو چار صحابہ کا خیال تھا کہ مجاہدوں کے لئے چونکہ مشاہرہ سسٹم کا رواج نہیں تھا لہٰذا انہیں میں تقسیم ہونی چاہئیں۔ چنانچہ بعض سپہ سالاروں اور کمانڈروں نے اپنی صوابدید کے مطابق "جابیہ" کی زمینیں سپاہیوں میں تقسیم کر دیں۔ اس کے برعکس فاروق اعظم ؓ موجودہ مسلمانوں کے ساتھ آنے والے مسلمانوں کے مفاد کو بھی نظر میں رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ نے صحابہ پر واضح کر دیا کہ متروکہ جائیداد سے زرعی اراضی' نہریں' چراگاہیں' و دیگر افتادہ زمینیں مراد نہیں ہیں۔ صرف جائیداد منقولہ' اونٹ' گھوڑوں' خچروں' سامان حرب یا مویشیوں کی

تقسیم مراد ہے۔ غیر منقولہ بیت المال کی تحویل میں رہیں گی۔ کاشتکاری کی نئی شرائط کے مطابق کسی بھی نئے یا پرانے کاشتکار سے کاشت کرائی جا سکتی ہے۔ کاشت کار کا زمین پر مالکانہ حق نہ ہو گا۔ چنانچہ آپ نے علاقہ جابیہ کی تقسیم شدہ اراضی مجاہدین سے واپس لے کر ان کی دلجوئی کے لئے فی حصہ اسّی تولہ سونا معاوضہ دے کر فارغ کر دیا۔ (کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف طبع سلفیہ مصر صفحہ 14)
(کتاب الاموال، امام ابو عبیدہ، طبع مصر صفحہ 59 اور کتاب الخراج یحیی بن آدم طبع مصر، صفحہ 27، 28، 48)

حضرت فاروقؓ بڑے بیدار مغز اور حساس حکمران تھے۔ آپ نے اپنے عمال سے کہہ رکھا تھا جب کبھی امر متنازعہ کا فیصلہ کرو تو یہ دیکھو کہ کہیں تم اس امر متنازعہ میں خود تو ملوث نہیں ہو (زرکلی طبع دوم مصر 204/5) اس طرح آپ نے انصاف بانٹنے والوں کو خود احتسابی کا پابند بھی کر دیا کہ اس کے بغیر انصاف میں کجی کا امکان ہو سکتا تھا۔ ظاہری کا بیان ہے کہ **کان عمر اذا انزل به الامر المعضل دعا الشبان فاستشارهم یبتغی حدة عقولهم** آپ ہر پیچیدہ معاملے میں "جواں فکر" سے رجوع کرتے تھے۔ غرض یہ تھی کہ نوجوانوں کو فکر کی گہرائی اور ذہنی آزمائش بھی ہوتی رہے اور جوان فکر آگے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ سنبھالنے کے قابل بھی ہو جائے۔ (تاریخ الامم و الملوک طبع مصر جلد 1/ 187، 217)

آپ زبردست لسانی شناور تھے اور قرآنی استدلات کے علاوہ بھی سخن سنجی، شعر گوئی و سخن طرازی آپ کا محبوب مشغلہ تھا (زرکلی 204/5) آپ انصاف کو خویش و بیگانہ کے امتیاز سے نہیں بانٹتے تھے جس کے حصے کا ہوتا تھا، اسے دے دیتے تھے، کیوں کہ آپ اہل قرآن تھے اور قرآن ہر وقت آپ کو یاد دلاتا رہتا کہ **لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا** (مائدہ، 8) پسند اور ناپسند کو آڑے نہ آنے دو انصاف جس کے حصہ کا ہے، اسے دے دو (مفہوم) چنانچہ تاریخ بتلاتی ہے کہ ـــــــــــ جبلہ بن ایہم (641م) جو غسانی قبائل کے آخری سردار تھے، زمانہ جاہلیت میں بڑے تناور و توانا حکمران تھے۔ دومتہ الجندل (12ہجری 633

م) اور یرموک (15 ہجری 635 م) میں شامی عربوں کی قیادت کرتے ہوئے جنگیں لڑیں۔ بعد میں رومن حملہ آوروں سے مل کر مسلمانوں کے خلاف زبردست نبرد آزمائی کی لیکن پھر رومیوں کی ہزیمت کے بعد جبلہ (Jabla) مسلمان ہو کر مدینۃ الرسول چلا گیا لیکن یہاں رہ کر اس نے محسوس کیا کہ فاروق اعظمؓ کے بے اونچ و نیچ انصاف سے انہیں فائدہ نہیں پہنچ سکے گا چنانچہ وہ واپس شام چلا گیا۔ بلاذری (892م) لکھتا ہے کہ لما قدم عمر بن الخطاب الشام سنه (17 ہجری 637م)

الاخ جبلة رجلا من مزينة فلطم عينه فامره عمرؓ بالاقتصاص منه فقال لو عينه مثل عيني والله لا اقيم ببلد علی به سلطان فدخل بلاد الروم مرتدا۔

جب فاروق اعظم 637 م میں شام میں تشریف لائے اور دیکھا کہ جبلہ نے ایک مزنی کو زور کا تھپڑ رسید کیا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی تو آپ نے حکم دیا کہ قانونی کارروائی کی جائے۔ اس پر جبلہ نے کہا کہ میری اور اس مزنی کی آنکھ ایک جیسی ہے؟ بخدا مجھے ایسی بستی میں رہنا نہیں آتا جہاں مجھ پر حکم چلانے والا کوئی دوسرا موجود ہو۔ یہ کہہ کر وہ رومیوں کی راجدھانی قسطنطنیہ کی طرف مرتد ہو کر فرار ہو گیا (بلاذری طبع مصر 141 و 142 ــــ ابن خلدون 2/281)

اس واقعہ سے مبرہن ہوتا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے انصاف کو فریق بننے نہیں دیا جبکہ ہو سکتا ہے کہ جبلہ اونچ نیچ والی لچک سے مسلمان ہی رہ جاتا بلکہ قبائل بنو لخم و بنو جذام بھی اسلام کے حصار ہی میں رہ جاتے۔ لیکن انصاف جب قرآن سے کشیدہ ہو تو بفرض محال مجرم عام انسان ہو یا بنت محمدؐ، اس میں لچک نہیں ہوتی۔ نہ صرف یہ کہ انصاف کی غیر مساوی تقسیم شیوۂ عمرؓ سے میل نہیں کھاتی، قرآن کا عدالتی نظام درہم برہم بھی ہو کر رہ جاتا۔

حصول انصاف کی تلاش: عباسی خلیفہ واثق باللہ 815 نے اپنے بڑے وزیر احمد بن ابی داؤد سے کہا کہ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ محکمہ قضا (عدلیہ) پر ایسے اشخاص کا تعین کرو جو صرف قرآن کی حاکمیت پر ایمان رکھتے ہوں کیوں کہ میں نے سنا ہے کہ

یہ قرآنی دانشور (معتزلہ) انصاف کے معاملہ میں دیانت اور داررسی کے محکم اصولوں پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ قاضی ابن ابی داؤد نے جو مملکت کے نشیب و فراز اور خلیفہ کے مذہبی میلانات کا بخوبی ادراک رکھتے تھے' جواب میں کہا کہ امیرالمومنین' کل ہی کی بات ہے کہ آپ نے **جعفر بن مبشر** (845 م) کو دس ہزار" روپے" بھجوائے' اس نے واپس کر دیئے۔ تب میں بذات خود رقم لے کر اس کے پاس حاضر ہوا تو اس نے بہت برا مانا اور سختی سے ڈانٹ دیا کہ پیشگی اجازت کے بغیر ایسی پیشکش وجوب قتل کی خواہاں ہے۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ میں "عدلیہ" کے لئے ایسے شفاف لوگوں کو کیسے رام کر لوں؟ (بحوالہ طبقات المعتزلہ——(امام احمد بن یحییٰ صفحہ 77)

انصاف والے آگے نہیں آتے: **امام علی بن الحسن الصندلی** (1091م) بڑے بلند پایہ معتزلہ (یعنی دانشورِ قرآن) تھے۔ سلطان طغرل بیگ (1063 م) چاہتے تھے کہ مملکت کا سب سے اونچا منصب یعنی محکمہ قضا آپ کی تحویل میں دے دیں' چنانچہ انہیں ساتھ لے کر بغداد وارد ہوئے مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ آپ بڑے لوگوں کی مصاحبت پسند نہیں کرتے اور پھر ایسا ہوا کہ واپس نیشاپور پہنچ گئے۔ ایک دفعہ سلطان طغرل نے دیکھا تو کہا صندلی تم عجیب بندے ہو کہ ہم تمہارا اعزاز چاہتے ہیں اور تم ہو کہ ہم سے کھچے کھچے رہتے ہو؟ فرمایا میں چاہتا ہوں کہ تم ایک اچھے سربراہ مملکت بنو۔ علماء کو خود ملنے جاؤ نہ یہ کہ ان کو اپنا دم چھلا بنا کر ساتھ لئے لئے پھرو۔ (**الجواہر المضیئۃ** جلد 257/1)

اہل انصاف کی قدر افزائی: اسمٰعیل عرف صاحب بن عباد (995م) لغت اور ادب کے بڑے امام تھے۔ قرآنی دانشوروں میں شمار ہوتے تھے یہ موید الدولہ بن بویہ کے وزیر تھے۔ بڑے علم دوست وزیر باتدبیر تھے۔ بویہ فیملی کا تعلق اگرچہ شیعہ مدرسہ فکر سے تھا تاہم اتنا شعور تھا کہ انصاف کا استحصال نہ ہونا چاہیے۔ اس نے اسماعیل یعنی صاحب بن عباد کو حکم دیا کہ ملک میں علما کی ایسی ٹیم پھیلا دی جائے جو انصاف کا کلچر عام کر دے۔ صاحب نے کہا کہ یہ درست ہے کہ حکومت شیعہ کی ہے

اور شیعہ اخلاقیات کو بجبر پھیلانا بھی شاہی مقاصد میں شامل ہے مگر عدلیہ کو شیعہ کے سپرد کر دینے سے مفاسد پھوٹ پڑیں گے۔ بہتر ہے کہ کسی شیعہ کو نہ گورنر بنایا جائے نہ عدلیہ کا سربراہ۔ لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ آج کے ماحول میں صرف دانشوران قرآن (معتزلہ) ہی لوگوں کو مطمئن کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ مشکلات کا حل قرآن ہی سے کشید کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں چنانچہ موید الدولہ نے صاحب بن عباد کی رائے پر صاد کیا اور عدلیہ کے لئے وقت کے بڑے امام مفسر اور قرآنی دانشور، سکہ بند معتزلی **امام ابوالحسن بن عبدالجبار بن احمد' بن عبدالجبار بن الخلیل بن عبداللہ الاہسانی** (1025م) کو گورنری اور چیف جسٹس کے ہر دو مناصب پر فائز کر دیا جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیت کے ساتھ عدالتی نظام کو قرآنی انصاف پر استوار کیا جبکہ ایک مرحلے پر صاحب بن عباد کو کہنا پڑا **افضل اهل الارض و اعلم اهل الارض** روئے زمین کا افضل ترین انسان اور عالم ترین انسان (طبقات المعتزلہ صفحہ 112)

انصاف قرآن کے بغیر ناممکن : خلیفہ مامون عباسی (833م) وقت کے حاکم بھی تھے' عالم اور محدث بھی' شاعر ادیب اور خطیب بھی۔ بڑے بڑے اہل علم کا آپ کے ہاں جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ خود بھی بڑے صاحب تصنیف تھے۔ اسے پتا چلا کہ ملاحدہ' منکرین قران اور مانی کے پیروکار کہتے پھرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ ان کے اس پروپیگنڈا پر مامون کا دل بڑا رنجیدہ رہتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ جب مملکت کے کلیدی عہدوں پر یہ عجمی فائز ہیں مذہب میں اتنے آزاد کہ اسلام پر کھلے عام زبان تشنیع دراز رکھتے اور پھر بھی کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے۔ کتنی ستم ظریفی ہے۔ بہرحال اس نے کسی منفی رد عمل کا اظہار کرنے کی بجائے حکم دیا کہ ہر فرقہ کے اہل فکر و اہل نظر کو جمع کیا جائے تاکہ یہ گفتگو کھلے عام ہو جائے۔ عجمی چونکہ علوم میں اپنا مثیل نہیں رکھتے تھے' لہٰذا مامون نے حکم دیا کہ ان سے دفاع اسلام کے موضوع پر صرف متکلمین اسلام' دانشوران قران' معتزلہ اور فلاسفہ ہی گفتگو کریں گے۔ اس طرح عملی طور پر انہوں نے دفاعی ذمہ داری کا بار گراں معتزلہ

کے شانوں پر ڈال دیا۔ جب معتزلہ کامیاب ہو گئے تو حکم دیا کہ یہی لوگ انصاف کی راہوں سے آگاہ اور قرآنی مناہج عدل سے باخبر ہیں۔ لہٰذا انصاف کو عام کرنا ان ہی کی ذمہ داری ہے (تاریخ بغداد جلد 183/10 ابن اثیر 144/6، و 148 - طبری 293/10)

معرکہ انصاف و ستم رانی: امام عمر بن عبدالعزیز (702م) دیانت و دادرسی کے پیکر تھے، سخی تھے، علم دوست اور فدائے عدل تھے۔ امام غیلان دمشقی (723م) جوان کے جگری یار و بے تکلف مصاحب تھے، بلکہ بہت سی باتوں میں ان کے استاد بھی تھے۔ قرآن دوستی دونوں میں قربتوں کا ذریعہ بن گئی۔ اس سے پہلے عمر بن عبدالعزیز جب مدینہ منورہ میں رہائش پذیر تھے تو وقت کے بڑے بڑے اہل قرآن امام صالح بن کیسان (757م) کے ہاں اپنے دونوں بیٹوں کو تعلیم و تادیب کے لئے منتخب فرمایا اس طرح اعتزال سے آپ کی طبعی مناسبت کا پتا چلتا ہے۔ ہاں تو امام عمر بن عبدالعزیز کو امام غیلان نے ایک بار لکھا کہ سنا ہے کہ **ان العامۃ من الشام زعموا ان الظلم بقضاء اللہ و قدرہ و انک تقول بذالک۔ فقال سبحان اللہ ان اتبع مظالم بنی امیہ** شام والے بنی امیہ کے مظالم کو نوشتہ تقدیر سمجھتے ہیں۔ سنا ہے آپ بھی ان ہی کا عقیدہ رکھتے ہیں؟ اس پر عمر بن عبدالعزیز نے کہا سبحان اللہ میں اور بنی امیہ کے مظالم کو نوشتہ تقدیر کہوں اور اللہ کے ذمہ لگاؤں کہ اسی نے ان کو ظلم کی راہ پر چلایا ہے؟ ناممکن (طبقات صفحہ 4/121 تا 6)

اس سے غیلان اور عمر کی بے تکلفی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ ابن یزداد علی بن محمد (1067م) کہتے تھے **کان عمر یستعجب من غیلان** عمر کو غیلان کی ہر ادا اچھی لگتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ایک طویل خط میں غیلان سے کہا۔ میری التجا ہے کہ میرے ناتواں شانوں پر حکمرانی کا جو بوجھ ڈالا گیا ہے، اس میں آپ میری مدد فرمائیں۔ غیلان نے جواب دیا میں نے انکار تو نہیں کیا لیکن تجویز دی ہے کہ بہتر ہے کہ انسداد مظالم اور بیت المال سے لوٹی ہوئی دولت کی بازیابی کے لئے

مجھے پورے اختیارات دے دیں تاکہ میں یکسوئی اور دل جمعی سے لوگوں سے رابطہ کر کے غصب شدہ املاک کا کھوج لگا کر صحیح صحیح برآمدگی کر سکوں۔ خلیفہ عمر نے کہا یہی کچھ میں نے بھی سوچ رکھا تھا۔ چنانچہ اب فل پاور کے ساتھ غیلان نے اپنا کام شروع کر دیا اور اس سے پہلے منادی کرا دی کہ لوگو! آؤ خائنوں کا مال خرید لو' لوگو آؤ ظالموں کا اثاثہ خرید لو۔ اور آؤ ان کا مال خرید لو جو بغیر احیائے اتباع سیرت کے خلیفے بنتے گئے۔

ادھر اسی نیلامی کے دوران ریشمی جرابیں ملیں جن کی چاندی کے بیس ہزار روپے قیمت تھی۔ وقت کے لحاظ سے یہ بیش بہا قیمت تھی۔ غیلان نے انہیں اٹھا کر لوگوں کو دکھاتے ہوئے کہا۔ مجھے وہ لوگ معاف رکھیں جو ان اموی لٹیروں کو ہدایت یافتہ حکمران سمجھتے رہے۔ ہاں ہاں یہ تو کھاتے رہے مگر لوگ بھوکوں مرتے رہے (طبقات صفحہ 9/26 تا 14)

انصاف اپنے گھر سے: شہزادہ عمر بڑے منصف مزاج اور عادل تھے۔ انہوں نے غیلان سے مل کر اگر لٹیروں پر آہنی ہاتھ ڈالا تو ساتھ ہی اپنی املاک بھی نذر انصاف کر دیں۔ بڑے جاگیردار تھے۔ سکنی اور زرعی اراضی' چراگاہیں' اور مال مویشی کثرت کے ساتھ آپ کی ثروت میں اضافہ کئے ہوئے تھے۔ لیکن دوسروں سے پہلے اپنی املاک نذر انصاف کر دیں۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ غیلان نے ضبطی املاک سے فارغ ہو کر زندگی کے ہر شعبہ میں انصاف کو زندہ کیا اور انصاف کو اتنا عام کیا کہ یہ اسلامی کلچر کا حصہ بن کر رہ گیا۔ رعایا نے سکھ کا سانس لیا اور ہر طرف عمر و غیلان زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے (ابن خلدون 76/3۔ تاریخ الخمیس 315/2)

انصاف پر خوفناک حملہ: امام احمد بن یحییٰ نے طبقات المعتزلہ میں لکھا ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز معتزلہ کے جلیل القدر اماموں میں سے تھے (ص 121) لیکن غیلان بایں جلالت شان' شاہی فیملی میں سے نہیں تھے۔ ان کے ضبطی املاک کے

قانون نے بنی امیہ کے شہزادوں کو مشتعل بنا رکھا تھا۔ وہ غیلان سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ **مر به هشام بن عبدالملک قال لوی هذا بعینی و بعیب آبائی و الله لئن ظفرت به لاقطعن یدیه ورجلیه** ایک دفعہ مستقبل کے حکمران ہشام کا غیلان پر گزر ہوا تو دانت پیستے ہوئے کہا اس غیلان نے مجھے اور میرے بزرگوں کو رسوا کر دیا۔ بخدا اگر میں نے اس پر (حاکم بن کر) قابو پایا تو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا (ص 15/26 تا 17)

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جوں ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز انتقال فرما گئے اور ہشام جانشین بنائے گئے اس نے اپنا انتقامی عمل شروع کر دیا لیکن غیلان اور اس کے ساتھی صالح آرمینیا چلے گئے تاہم ہشام نے دونوں کو واپس بلوا لیا۔ صالح کو پہنچتے ہی قتل کر دیا لیکن غیلان کے قتل کے لئے فتوے کا سہارا لینے کی ضرورت تھی جبکہ یہ ضرورت غیلان کے نظریاتی حریف امام **عبدالرحمان الاوزاعی** (774م) نے پوری کر دی۔ چشمک یہ تھی کہ امام اوزاعی کے نزدیک **الکتاب احوج الی السنة من السنة الی الکتاب** — قرآن حدیث کا محتاج ہے' حدیث قرآن کی محتاج نہیں ہے (**جامع بیان العلم** جلد 19/2) لیکن امام غیلان کا عقیدہ تھا کہ قرآن کتاب "محفوظ" ہے اور کوئی چیز نہیں ہے جسے "محفوظ" کیا گیا ہو۔ لہذا "محفوظ" کو غیر محفوظ کا محتاج نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا جواب امام اوزاعی اور اس دور کے بڑے سے بڑے قد آور عالم سے بھی نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن معقولیت کا دامن چھوٹ چکا تھا۔ امام اوزاعی نے فتویٰ داغ دیا کہ غیلان بے دین ہے قتل کر دیا جائے۔ اس پر کیسانیہ گیٹ پر مقتل سجایا گیا۔ اب مقتل کا ہیرو غیلان سامنے تھا۔ ہشام نے آگے بڑھ کر غیلان کو مخاطب کیا۔ اے غیلان یہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے' تمہارا خدا کر رہا ہے۔

جرم بذمہ خدا؟: غیلان نے کہا اللہ سے ظلم سرزد نہیں ہوتا **وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ** (ق' 29) اور ظلم کرنے والے پر اللہ کی لعنت۔ اب اتمام حجت ہو چکا۔ ہشام نے جلاد کو حکم دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالو۔ دونوں ہاتھ کاٹ دیئے گئے' پھر حکم

ہوا" تارا مسیح" آگے بڑھو اس کے دونوں پاؤں بھی کاٹ ڈالو۔ "تارا مسیح" نے اس حکم کی تعمیل بھی کر دی۔ لیکن غیلان پھر بھی بولتا رہا۔ تب ایک سرکاری امام نے اشارہ دیا اس کی زبان کھینچ لی جائے۔ تب ہشام نے اشارہ دیا کہ "تارا مسیح" دیکھ کیا رہے ہو' آگے بڑھو۔ اس نانجار کی زبان کھینچ لو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اب بولنے والی زبان بھی نہ رہی اور اعضا سے خون کے فوارے بہنے سے موت بھی واقع ہو گئی۔ تاہم جلاد کو حکم ملا کہ "تارا مسیح" اس کی لاش کو سولی چڑھاؤ۔

(ابن قتیبہ 2/245۔346 ـــــ لسان المیزان جلد 4/424)

لیجئے غیلان نے عمر بن عبدالعزیز سے مل کر حق و انصاف کا جو باب کھول رکھا تھا' ہشام نے اسے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا لیکن جو کچھ بھی ہوا' مستقبل کے امویوں نے آئندہ ہمیشہ کے لئے خزانہ لوٹنے میں "ہلکا" ہاتھ رکھا کہ اب لوگ انصاف کا ذائقہ چکھ چکے تھے۔ بے انصافی کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔

انصاف کی مکرر دستک: گو کہ انصاف اب بے یار و مددگار ہو چکا تھا تاہم عمر اور غیلان کے تابندہ نقوش دھندلے نہ ہونے پائے تھے کہ انصاف کی نئی دستک قومی درد سے سرشار اموی حکمران "یزید الناقص" کے کانوں تک پہنچ گئی۔ ان میں خلیفہ ابو خالد یزید (744م) بن الولید بن عبدالمالک بن مروان جو کہ معتزلہ کی "عدلی" شاخ کے ممبر تھے' اس نے حق و انصاف کی پکار پر لبیک کہا اور ہشام سے لے کر اپنے عہد تک کے عطایا اور بخششوں پر نظر ثانی کی اور عملاً یزید پر یہ راز کھلا کہ ہاتھ ہلکا رکھنے کے باوجود وظائف کی تقسیم میں کج ادائی پھر بھی سرایت کر گئی ہے۔ یزید' بنی امیہ میں سے ایسے گوہر نایاب تھے جو عقیدے کے پکے اور عمل میں لچک سے پاک تھے۔ یہ بھی عمر بن عبدالعزیز کی طرح معتزلی فکر کے تھے۔ جو اس وقت دانشوروں کا شناختی لقب تھے۔ معتزلہ کے پانچ اصولوں میں سے ایک اصول "عدل" بھی ہے لہٰذا ان میں سے جو بھی یہ مسلک اختیار کرتا ہے اس کا فرض بنتا ہے کہ عدل یعنی انصاف کا چلن عام کرنے کا جتن کرے۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیز کے بعد ان ہی امویوں کی

مروانی شاخ کے چشم و چراغ یزید نے حق و انصاف کا بول بالا کیا اور ابن عبدالعزیز کی صف کے بن گئے۔ مشوان الحمیری کہتے ہیں فمن یکن فی بنی امیہ مثلہ و مثل عمر بن عبدالعزیز (بنی امیہ میں یزید الناقص اور عمر بن عبدالعزیز جیسا کوئی حکمران نہیں گزرا (ابن خلدون 106/3 البدایہ و النہایہ جلد 11/10)

یہ یزید' حق و انصاف اور قرآنی حکمرانی کا علم بردار ہونے کی وجہ سے ائمہ اعتزال کے اتفاق بموجب امام بالحق تھے (طبقات صفحہ 120) اس یزید کے نام کے ساتھ "الناقص" ان کے نام کا تتمہ بن گیا ہے۔ وجہ یہ بنی کہ ہشام نے اپنی حکمرانی کے دوران بنی امیہ کے جو وظائف مقرر کئے تھے' یزید کے نقطہ نظر میں ہاتھ ہلکا رکھنے کے باوصف کچھ زیادہ ہی تھے چنانچہ اس نے حاکم بنتے ہی ان میں مزید کمی کر دی۔ عربی میں "کمی" کو "نقص" کہتے ہیں۔ اس طرح وہ یزید الناقص مشہور ہوئے۔ وقت کے بڑے شہنشاہ ادب اور دانشور قرآن امام عمرو بن عبید (761م) جن کی عفت اور پارسائی ضرب المثل تھی' کہتے ہیں کہ یزید الناقص مت کہو' کان نکالا علی اھلہ' وہ تو کامل تھے اپنے بے مہار خاندان کو نکیل ڈالنے والے تھے (ص 120)

انصاف درہ خیبر تک : سلطان محمود بن سبکتگین (1030م) ذو جہات شخصیت تھے۔ کسی نے فاتح کی نظر سے دیکھا' جس نے فتوحات کی ترنگ میں آ کر سومنات کے مندر گرائے' منصورہ کے کتب خانے جلائے۔ سندھ میں ہباری (Habbari) قریشیوں اور ملتان میں اسماعیلیوں کو شکست فاش سے دوچار کر کے ان کی حکومتیں ختم کیں اور کسی نے ایک اچھے منتظم بلکہ اچھے منصف کی حیثیت سے دیکھا اور اس کی خوبیوں کے گن گائے۔ لیکن میں ان کو ایک دانشور قران کی حیثیت سے دیکھتا ہوں جس نے بغیر کسی تقلیدی نسبت کے زمانے کے شہرت یافتہ علما و افاضل اور مفکرین کو دربار میں جمع کر رکھا تھا۔ ایک تو سلطان خود بھی عالم تھا خاص کر ماضی کے چار سو سال تک آزادانہ غور و فکر کی جو لہر چل رہی تھی' ناممکن تھا کہ اس سے متاثر نہ ہوں۔ انہوں نے جب محسوس کیا کہ افاضل کے اتنے جم غفیر میں معتزلہ کی کمی ہے

اور یہ شہرہ کہ انصاف صرف معتزلہ کے بلند کردار اور وسعت نظر اور قرآنی بصیرت کے طفیل ہی عام ہو سکتا ہے' چنانچہ سلطان موصوف نے وقت کے بڑے نابغہ علامہ ابو الفتح اصفہانی جو کہ گروہ علماء کے سرخیل بھی تھے' اسے لکھا کہ معتزلہ کے تین جید عالم غزنی روانہ کریں جو لوگوں میں آ کر دانش قرآن کو عام کریں اور انصاف میں لوگوں کا جو حصہ بنتا ہے' اسے قرآنی بصیرت کے مطابق بانٹیں۔ قرآنیات کے مراکز کھولیں اور قرآنی حاکمیت کا برملا ڈنکا بجائیں۔ چنانچہ علامہ ابو الفتح اصفہانی نے نیشاپور کی جامع مسجد کے امام ابو صادق' گرامر ادب اور قرآنیات کے رمز شناس علامہ ابو الحسن الصابونی اور فضیلت کے ایک دوسرے قد آور حامل کو ہمراہ کر کے تین جید علماء کا گروہ غزنی بھجوا دیا۔ سلطان نے قرآن کے حامل ان علما کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا اور عدلیہ کے اونچے مناصب پر فائز کرنے کے علاوہ انتظامیہ کے بعض کلیدی عہدوں پر بھی ان ہی کو متعین کیا۔ سلطان کو یقین تھا کہ یہ لوگ انصاف جس کے حصہ کی چیز ہے' اسے حق دینے کے امین ہیں۔ چنانچہ سلطان نے ان تین علما اور پھر ان کے بے شمار شاگردوں کی معدلت گستری کے طفیل 33 سال تک غزنی سے پشاور کے خیبر بازار تک بے فکری سے حکمرانی کی کہ اعتزال ان دنوں باعث فخر و انبساط ہوتا تھا۔ تاتاریوں کے ہلاکت خیز طوفان نے جب تمام قدروں کو الٹ کر رکھ دیا' علم اور اجتہاد کا باب بھی ختم ہو گیا۔ جب سے اعتزال کو گالی بنا دیا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرسید رحؒ میموریل لائبریری، کالج سٹاپ جی ٹی روڈ، باغبان پورہ، لاہور

آپ کی خدمت میں دینی کتب لاگت قیمت پر مہیا کرتی ہے

☆ درج ذیل کتب دستیاب ہیں ☆

(1) لباس اور چہرہ کیسا ہونا چاہیئے	رحمت اللہ طارق	20.00
(2) قتل مرتد کی شرعی حیثیت	رحمت اللہ طارق	25.00
(3) عورت اور مسئلۂ امارت	رحمت اللہ طارق	20.00
(4) قربانی کی شرعی حیثیت	رحمت اللہ طارق	10.00
(5) قرآن کا معاشی نظریہ	رحمت اللہ طارق	25.00
(6) ہمارے دینی علوم	اسلم جیراجپوری	30.00

☆ نوٹ: یہ قیمتیں ڈاک خرچ کے علاوہ ہیں۔ وی پی پی کا انتظام نہیں ہے ☆

☆ درج ذیل کتب بھی دستیاب ہیں ☆

(1) تفسیر منسوخ القرآن	رحمت اللہ طارق	250.00
(2) تفسیر میزان القرآن	رحمت اللہ طارق	400.00
(3) تفسیر برھان القرآن	رحمت اللہ طارق	600.00

قرآن کا معاشی نظام بحال کرو

☆

رحمت اللہ طارق

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مذاہب و مسالک کی کثرت اور مسائل کی تعبیر و تاویل نے "دین" کو ایسا معمہ بنا دیا ہے کہ دین جس نے عرب کے بادیہ نشینوں کو دنیا کی تقدیر کا مالک بنا دینے کی نظیر قائم کر دی تھی اس دین کے نام لیوا کرۂ ارض پر ہر طرف زوال و ادبار اور فکر و نظر کی محرومی سے دوچار ہو گئے اور اس دین کے ماننے والوں کے لئے "نشأۃ ثانیہ" کی کوئی صورت امید فردا کے ماسوا باقی نہ رہی ـــــ مذہبی مناقشات نے "ذہنی خانہ جنگی کی ایسی فضا تیار کی کہ آج جب ہم معیشت اور معاشرت کے باب میں کوئی سی بھی "رہنمائی" جب اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے لینا چاہیں تو اسی "ذہنی پس منظر" کے مقرر کردہ حدود اور "مفاصل" کے سانچے میں رکھ کر ہی حاصل کرنے پر مجبور ہیں ـــــ گو ان حالات کی تشکیل میں بہت سے عوامل کارفرما ہیں لیکن سب سے بڑا عامل ہمارے اہل علم کی اقتصادی بدحالی اور بے بسی ہے جس نے ہمیں ذہنی توازن کے فقدان اور "لامرکزیت" کا نشانہ بنا ڈالا ہے اور یہ لامرکزیت اہل علم کی سوچ اور فکر کے ہر گوشے کو متاثر کرتی رہی ہے اس کی روشنی میں آج اگر ہم چاہیں کہ اپنی معیشت اور معاشرت کے لئے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ حاصل کر لیں تو ـــــ ذہنی پس منظر اور "لامرکزیت" ہمارا ہاتھ روک لیتی ہیں اور ہم دھندلے نقوش کے ماسوا کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے ـــــ تاہم سرسید مرحوم نے جو کہ معاشی مفکر اگرچہ نہیں تھے لیکن ہر گونہ تحقیق و ریسرچ کی نیو اٹھا کر صدیوں کی طاری غنودگی کو ختم کر کے جس طرح ہماری چشم عبرت کو وا کیا ہے اسی طرح تجدید و اصلاح کے بہت سے مراحل طے کرنے میں اہم کردار بھی ادا کیا ہے اور ہم پورے اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دامن میں علم و حکمت کے

ماسوا بھی معیشت اور معاشرت کے ایسے تابناک موتی فراوانی سے موجود ہیں جو اقوام کی ترقی یافتہ فکر کے مقابل رکھے جاسکتے ہیں۔

معیشت جس کی استواری سے صحت مند معاشرہ جنم لیتا ہے "انسان بنانے" میں اتنا اہم رول ادا کرتی ہے کہ اسکی استواری کے بغیر کوئی بھی معاشرہ ــــ رہن سہن اور طرز زندگی شائستہ اور قابل رشک نہیں بنا سکتا لہٰذا یہ کہنا کہ اسلام نے معیشت کی استواری سے آخرت سنوارنے پر زیادہ زور دیا ہے غلط اور علمی بنیادوں پر نامکمل استدلال ہے ــــ قرآن جب یہ کہتا ہے کہ ــــ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى ــــ (اسراء ' 72) تو ایک گونہ پالیسی عطا کرتا ہے کہ دنیا سنوارنے ہی سے مستقبل سنورنے کی امید رکھی جاسکتی ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب میں ذیلی عنوانات کے ذریعے فکر پیغمبر صلی اللہ علیہ و سلم کے جستہ جستہ ایسے شہ پارے پیش کرنا چاہوں گا جو معیشت جدیدہ کے لئے نشان راہ کا کام بھی دے سکیں اور مسلمان سرمایہ داروں پر انسانی تقاضے بھی واضح کر دیں ــــ یہاں پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ و سلم کی ذاتی فکر کو مفکرین اسلام کے الفاظ اور کردار کی شکل میں پیش کروں گا کہ ہمارے مفکرین کی نتائج فکر کا ماخذ اور نظریہ کشید کرنے کا منبع بھی واضح ہوتا چلا جائے۔ و باللہ التوفیق۔

کیا روٹی طبقاتی معیار کے مطابق ملنی چاہیئے۔

کہا جاتا ہے کہ روٹی قانون قدرت کی رو سے طبقاتی معیار کے مطابق ملنی چاہیئے اگر کوئی بڑا ہے تو اسے فراوانی سے اور اگر سماجی رتبے کے اعتبار سے لوگوں کی نظر میں کوئی چھوٹا ہے تو اسے "تنگی" سے میسر آنی چاہیئے وغیرہ ــــ یہ ایک نظریہ ہے جسے مذہبی قیادت زور شور سے پیش کرتی ہے لیکن قرآن پاک مزعومہ طبقاتی معیار کو ملحوظ نہیں رکھتا۔ یہ انسانوں ہی کا مقرر کردہ معیار ہے۔ اس سے "نفسیات عمل" اور فلسفہ سعی و محنت کی نفی ہو جاتی ہے۔ سورج کی مساوی تابانی' چاند کی روشنی اور

بارش کی یکساں فیض رسانی سے طبقاتی معیارات کی تکذیب ہو جاتی ہے جبکہ طبقاتی معیار کے محو کرنے پر ہی کائنات کی فوز و فلاح کا انحصار ہے۔ علامہ شہاب الدین آلوسی (1854م) فرماتے ہیں ــــ

یفعل کل واحد من البسط والقدر ای التضییق والقتر لا لکرامة توجب البسط ولالھوان توجب التضییق

روزی کو کھلا چھوڑنے اور پیمانے (القدر) کے مطابق دینے کی طاقت اور اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے وہ اگر (سعی و عمل کے قانون کے مطابق) کسی کی روٹی میں اضافہ کرتا ہے تو اس کی وجہ کسی طرح کی طبقاتی برتری نہیں ہے (لا لکرامة) اور اگر کسی کی روٹی (سعی و عمل میں کمی کے باعث) بقدر پیمانہ ملتی ہے تو اس کی وجہ بھی یہ نہیں کہ ــــ حاجتمند طبقاتی پستی کا حامل ہے (ولا لھوان)

(تفسیر روح المعانی طبع مصر جلد 107/20'108/1)

یہ تشریح واضح کرتی ہے کہ روزی کی کمی یا بیشی اسباب کے مطابق اگرچہ متفاوت ہو سکتی ہے تاہم اس سے طبقاتی تقسیم اور معیشت کا طبقاتی استدلال نہیں ہو سکتا۔

بے مصرف ملکیت نذر آتش۔

مورخین اور اہل سیر لکھتے ہیں کہ مملکت کے ایک حصہ میں رزق کی فراوانی اور دوسرے میں کم یابی فاروق اعظمؓ کو بیحد ناگوار گزرتی تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ عراق کے گورنر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص (675م) نے تنگ آکر لوگوں سے روٹین کے ماسوا میل جول ترک کر دیا تھا۔ فاروق اعظمؓ نے محسوس کیا کہ اس طرح فاقہ مست اور بدحال اپنی شکایات نہ پہنچا سکیں گے چنانچہ **محمد بن مسلمہ** (663م) کو فرمان دے کر عراق بھیجا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے استدلال کرتے ہوئے اس "علّت" کی وضاحت کی جس کی رو سے سعد کو سخت

تنبیہہ سے دوچار ہونا تھا فرمایا ——— حولی اهل المدینة قد قتلهم الجوع و قد سمعت رسول الله یقول لا یشبع الرجل دون جاره

سعد! یہاں اہل مدینہ ہیں کہ فاقوں مر رہے ہیں اور تم ہو کہ ہم سے غافل ہو —— میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ —— آپ ؐ فرمارہے تھے —— فاقہ زدہ ہمسائے کو چھوڑ کر خود سیر ہو کر کھانا ابن آدم کے لئے روا نہیں ہے۔

(مسند احمد طبع دار المعارف مصر جلد 322/1 —— تو کیا تم ابن آدم نہیں ہو)

محمد بن مسلمہ یہ فرمان لے کر جب عراق پہنچے اور کوفہ کے نزدیک سعد کے محل کے قریب ہوئے تو —— اخرج زنده واروى ناره و ابتاع حطباً بدرهم

ایک درہم کی لکڑیاں خرید لیں سعد کے دروازے پر جمع کردیں اور چقماق رگڑ کر دروازے کو آگ لگادی —— دروازہ جل کر راکھ ہو گیا —— آگ آگے بڑھنے لگی تو لوگ دوڑے ہوئے سعد کے پاس پہنچے —— سعد نے کہا کہ یہ کام محمد بن مسلمہ نے کیا ہو گا —— بہرحال سعد اپنی غفلت اور تساہل پر نادم ہوئے اور محمد بن مسلمہ اپنے مشن کی تکمیل کے 19 دن کے بعد واپس مدینہ منورہ پہنچے۔

(طبری طبع بولاق 193'192/4 —— تاریخ ابوالفدا طبع مصر 75'74/7 —— تاریخ ابن اثیر 222/2 تا 224)

اس حدیث میں جار کا لفظ واقع ہے جس کے معنے پڑوسی کے ہیں لیکن فاروق اعظم ؓ نے اسے وسیع تر مفہوم میں استعمال کرنے کے لئے دیواری ہمسائے سے نکال کر مملکت کے ہر حصہ کو دوسرے حصہ کا ہمسایہ ٹھہرایا ہے یعنی ملک کے کسی پسماندہ علاقے پر اگر غربت کا منحوس سایہ پڑا ہے تو دوسرے دور دراز علاقے یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہو سکتے کہ ان پر ہمسائیگی کی تعریف صادق نہیں آسکتی کیونکہ فاروق اعظم ؓ کی پالیسی کے مطابق اسلام آباد کا ہمسایہ جس طرح پنڈی ہے اسی طرح تھرپارکر

بھی ہے اب تھرپار کر میں اگر بارش نہیں ہوئی — قحط پڑا ہے مویشی مر رہے ہیں تو اس کا ذمہ دار اسلام آباد ہے اور وہی اس قومی المیہ کا تدارک کرے گا — اس حدیث میں ذرائع معیشت کو غلط طریقوں سے استعمال کرنے والے نوکر شاہی کے محاسبے پر بھی استدلال کیا جا سکتا ہے یعنی حالات جب قابو میں نہ ہوں' نوکر شاہی اور سرمایہ داروں کی ملی بھگت سے ملکی اصطلاحات کا پہیہ پٹڑی سے اتار لیا گیا ہے تو عوام کو حق پہنچتا ہے کہ ان کے دروازوں پر دستک دیں اور ان کی بے مصرف اور بے مقصد املاک کو نذر آتش کر دیں کہ اقبال نے بھی اشارہ نبوی اور اسوہ فاروقی سے یہی اخذ کیا ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

غربت کا بنیادی سبب سرمایہ داروں کا وجود ہے۔

امام ابو محمد علی بن حزم اندلسی (1064م) سورہ مدثر کی (44 ویں) آیت سے اپنے مخصوص انداز میں استدلال کرتے ہوئے سرمائے اور دولت کے پرستاروں کو وطن دشمن' ملت کش اور اسلام سے باغی کہتے اور فرماتے ہیں —

فان جاعوا — او عروا — و جهدوا فيمنع الاغنياء

مملکت کا نادار طبقہ ——— بھوک' ننگ اور موت کا جب بھی شکار ہوا ہے تو اسکا بنیادی سبب سرمایہ دار ٹولے کا وجود بنا ہے

(المحلى — طبع منیریہ مصر جلد 6/156/11 تا 14)

کیونکہ یہ ٹولہ ذرائع معیشت پر قابض ہو کر سب کا راستہ روک لیتا ہے۔

ذخیرہ اندوز کی موت ناقابل قصاص ہے

فقہانے غالباً اس خیال سے کہ پانی کے حصول اور غذا کی فراہمی کے سلسلہ میں "تشدد" میں فرق کیا ہے کہ پانی خدا کی ملکیت ہے جو عام ہے اور غذا محنت کا نجی ثمر——جو عام نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا پانی کے لئے لڑنا' جھگڑنا اور بالآخر قتل تک نوبت پہنچانا——تو جان بچانے کی حد تک جائز ہے لیکن کسی کی نجی املاک کو بذریعہ تشدد حاصل کرنا روا نہیں ہے وغیرہ——لیکن ہمارے ابن حزم فقہا کی اس منطق کو تسلیم نہیں کرتے ان کا خیال ہے کہ——اضطراری حالت میں خنزیر اور مردار کو غذا کے بطور استعمال کرنے کی اس صورت ہی میں اجازت ہے جب کسی بھی شخص کے پاس مضطر کی ضرورت پوری کرنے کا انتظام نہ ہو لیکن کسی کے پاس اگر گنجائش ہے اور وہ اپنے ہم جنس سے اسے دریغ رکھتا ہے بلکہ تڑپتا دیکھ کر بھی دریغ رکھتا ہے تو اب صورت حال وہ نہیں رہے گی جو فقہانے تجویز کر کر رکھی ہے بلکہ یوں ہو گی——

و له ان یقاتل علی ذالک فان قُتل فعلٰی قاتله القود۔ و ان قتل المانع فالٰی لعنة الله لانه منع حقا و هو من طائفة باغیة

> ایسے مجبور کو اجازت ہے کہ اپنی غذا بہ جبر حاصل کر لے لیکن اگر وہ ذخیرہ اندوز سے مقابلہ نہ کر سکا اور مارا گیا تو ذخیرہ اندوز سے قصاص لیا جائے گا اور اگر ذخیرہ اندوز ہی مارا گیا تو اب اس کا کوئی قصاص ہی نہیں ہے بلکہ اس پر اللہ کی لعنت مستزاد کہ اس نے حقدار کا حق مار کر اپنے کو باغی اور تخریب کار ٹولے میں شامل کر کے جہنم واصل ہوا۔

(المحلیٰ جلد 6/ 159 / 20 تا 22)

کیونکہ ذخیرہ اندوز جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے لعنت بھیجی ہے **(المحتکر ملعون - رواہ احمد)** اور اپنے کردار کے لحاظ سے لوگوں کی روٹی روک کر ایک گونہ رہزن' قاتل' ڈکیت بلکہ مملکت کے باغی کا روپ دھار لیتا ہے لہٰذا اس کی سزا وہی ہے جو کسی قاتل کی ہوتی ہے۔

ذخیرہ اندوز کے بارے میں یہ خیالات ہمارے ابن حزم کی اصابت رائے کا بولتا ثبوت ہیں اور غماز ہیں کہ ابن حزم ہمارے بہت سے دیگر اسلاف کی طرح ملوکیت اور ملائیت کے گھناؤنے کردار کے خلاف تھے حالانکہ خود وزیر اعظم بھی رہ چکے تھے۔

امیر کھائیں اور غریب بھوکوں مریں۔

تاریخ و سیرت کے مشہور امام محمد بن سعد (845م) حضرت انسؓ بن مالک کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ —

تقر قربطن عمر بن الخطاب و کان یأکل الزیت عام الرمادہ کان حرم علیه السمن فنقر بطنہٗ با صبعہٖ قال تقرقر۔ تقرقوک انه لیس لک عندنا غیرہ حتی یحیی الناس

18 ہجری میں جب قحط پڑا تو اسکی شدت اور ہولناکی کے پیش نظر اس سال کو "عام الرمادہ" کے نام سے پکارا گیا پورے انیس ماہ تک یہی کیفیت رہی کہ لوگوں کو ہر طرف غبار اڑتا دکھائی دے رہا تھا۔ ان دنوں فاروق اعظم نے عہد کر رکھا تھا کہ تاوقتیکہ لوگوں پر زندگی کی رمق لوٹ کر نہیں آتی وہ مرغن غذا یا کم از کم خالص گھی استعمال نہیں کریں گے (حرم علیه السمن) چنانچہ اس پابندی سے آپ پیٹ کی خرابی میں مبتلا ہو گئے قر قر کی ریحی آوازیں آنے لگیں اور آپ نے پیٹ کو اپنی انگلی سے بجاتے ہوئے (فنقر بطنہ) فرمایا کہ — اب تاوقتیکہ سب کے سب لوگ گھی کھانے کے اہل نہ ہو جائیں تمہارے لئے یہ تیل کی غذا ہی رہے گی (یاکل الزیت)

(طبقات ابن سعد طبع بیروت 1957م جلد 3/ 313/ 9 تا 12، 17 تا 19)

بلکہ ابو عبید قاسم بن سلام (838م) نے **"الاموال"** میں لکھا ہے کہ — خلیفہ اعظم کی اس تکلیف کا جب لوگوں کو پتہ چلا تو انھوں نے گذارش کی کہ آپ گھی کو ترک نہ فرماویں — لیکن آپ نے فرمایا کہ — کیا گھی سبھی کو میسر ہے؟ مقصد یہ کہ جب تک سبھی لوگ گھی استعمال کرنے کے قابل نہ ہوں میں امتیازی کھانا ہرگز نہ کھاؤں گا۔

فاروق اعظمؓ کا یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ جہاں کہیں، جب کبھی، اور جس کسی "علت" کے باعث معاشرے میں مفلوک الحال نمودار ہو وہاں افراد معاشرہ میں اعتماد پیدا کرنے کے لئے حکومت کو پہل کر کے معیشی مساوات قائم کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کر دینی چاہئیں۔ ابن حزم نے لکھا ہے **و یجبرهم السلطان علی ذالک۔** ہیئت حاکمہ کا فرض ہے کہ ذرائع پیداوار پر جبرا قبضہ کر کے یا **قابضین** کو مجبور کرے کہ وہ لوگوں کی بنیادی ضروریات کی تکمیل میں حصہ لیں **(المحلی 12/156/6)**

چھوٹے اور بڑے کا معاشی امتیاز نہ رہنے دوں گا۔

ابن سعد اپنی سند کے ساتھ راوی ہے کہ ــــ **لئن بقیت الی الحول لا لحقن اسفل الناس با علاهم**

میں (عمرؓ) اگر اگلے سال تک زندہ رہا تو میری اصلاحات کا پہلا عمل یہ ہو گا کہ میں نچلے طبقے کو ابھار کر اعلیٰ طبقے کی سطح پر لا کر اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز ختم کر کے سب کو یکساں معیشت کا حامل بنا ڈالوں گا۔ **(ابن سعد 3/302/3 تا 5)**

فاروق اعظمؓ کے انسان دوستی اور انسانیت نوازی کے اتنے اہتمام کو ہماری مذہبی قیادت اسلام ہی کے نام پر ملحدانہ اشتراکیت سے موسوم کر کے اپنے ہی اسلاف کو رگیدنے میں کتنی بے باک واقع ہوئی ہے؟

ایک سے زیادہ مکانات رکھنے کا مسئلہ۔

علامہ عبدالروف مناوی (1621م) مفسر **علی بن احمد الحرّالی (1241م)** کے حوالہ سے لکھتے ہیں ــــ **کل متزید علی کفافہ تموّلا من الدنیا زائد علی کفاف منه من مسکن و ملبس و مرکب فھو محجّرٌ علی مَنْ سواہ من عباد اللّٰه ذالک**

المفضل الذي هم احق به منه

حدیث — **لیس لابن آدم حق**— کے معنے ہیں — کوئی بھی آدم اپنی ضروریات سے زیادہ سمیٹنے کا حق دار نہیں ہے لہٰذا کوئی بھی شخص اپنے قبضے میں ضرورت سے زیادہ مکان' ضرورت سے زیادہ ملبوسات اور ضرورت سے زیادہ سواری رکھتا ہے تو وہ درحقیقت دوسروں کا حق مارنے کا مرتکب ہو جاتا ہے (**محجوٌ علی من سواہ**) جبکہ رسالت مآب ﷺ کی زبانی فیصلہ یہ ہے کہ— ضرورت سے زیادہ پر قابض کا حق رہتا ہی نہیں—

(**فیض القدیر** طبع اول 1938م جلد 5/379/29 تا 30)

یہ تشریح واضح کرتی ہے کہ محولہ حدیث اپنے معروضی مفہوم میں یہ راہنمائی بھی کرتی ہے کہ ایک سے زائد مکان رکھنا بھی روا نہیں ہے اور مالک کو حق نہیں پہنچتا کہ زائد پر قابض رہے (**لیس حق**) اور حکومت وقت اگر— **ان الحکم الا للّٰہ**— کی اساس پر قائم ہے تو مجاز ہے کہ حدیث کی روشنی میں "بے گھروں" کے مسائل حل کرنے کے ضمن میں سکنی املاک کا جائزہ لے اور ذاتی رہائش کے مکانات کو چھوڑ کر دیگر کو **قابضین** سے واگزار کر کے بے گھروں کے سپرد کرے— امام ادب و تفسیر علامہ زمخشری (1144م) فرماتے ہیں—

رہائش ' لباس' روٹی اور پانی وہ بنیادی ضرورتیں ہیں جن کے بغیر انسانی زندگی کی تکمیل ناممکن ہے (**بحوالہ فیض القدیر** 5/380/7 تا 8)

مکان کی اہمیت اس سے نیز واضح ہے کہ جنت جس کے تصور نے ہمیں شیخ چلّی بنا رکھا ہے وہاں بھی مکان کے بغیر جنت جنت نہ ہو گی۔ علامہ **نظام الدین الحسن بن محمد بن الحسین** عرف "**القمی**" (1446م) **لا تضحٰی** (طٰہٰ' 119) کی تشریح میں لکھتے ہیں۔

والمراد به الكنّ مع ان الجنة ليس فيها شمس حتى يتصور فيها الضحاء

باوصف کہ جنت میں سورج کا گذر نہ ہو گا اسکے باوجود "**لا تضحٰی**" فرما کر واضح کیا کہ وہاں دھوپ سے بچنے کے لئے مکان بھی عطا ہو گا کہ وہ بھی نعمت غیر مترقبہ ہے۔

(تفسیر غرائب القرآن طبع بولاق 1328ہجری جلد 16/142/8 تا 12)
غور فرمایئے جسے ہم جنت کہتے ہیں اسے بھی راحت و آسائش کے قابل اسی وقت ہی سمجھا جائے گا جبکہ مکان جیسی مادی ضرورت کا مکمل انتظام ہو گا۔
یہ رخشندہ شذرات جن کے مطالعہ سے معاشی اور معاشرتی انقلاب کے بانی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے اصلاحی اور فلاحی اقدامات کا بخوبی پتا چل سکتا ہے ان میں قدیم معاشی تصور کی نشاندہی بھی کی گئی ہے اور جدید معاشی و معاشرتی نظریات کے لئے خام مال بھی فراہم کیا گیا ہے ایسے میں جو لوگ کج ذہنی سے روٹی' کپڑے' مکان' تعلیم اور صحت جیسی بنیادی ضروریات کو طنزیہ لہجے میں ذکر فرماتے ہیں وہ ذہن میں رکھیں کہ یہ ضروریات حقائق پر مبنی ہیں۔ انھیں "طنزیات" کی ذیل میں نہیں لایا جا سکتا ــــ مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنے معروضی حالات کے مطابق ایسی تفاصیل سے استفادہ کریں۔

قرآن کی جنرل پالیسی ۔

میرا مضمون قرآنی معیشت کے بارے میں بطور مثال چند جزئیات پر مشتمل ہے ویسے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ معیشت کے بارے میں مسلم سیاستدانوں نے کبھی سوچا تک نہیں۔ بلاشبہ مسلم لیگ ایک بہت بڑی جماعت تھی اور اس کا تاریخی کردار ہے لیکن وہ بڑوں کی بہبود ہی کے لئے سوچ سکتی تھی۔ ان کے حقوق کے لئے' ان کے مراتب کے لئے اور انکی امتیازی بہتری کے لئے ــــ اسکی انتہائی کوشش رہی کہ عوام کو طاقت کا سرچشمہ ظاہر کر کے ان کی قربانیوں پر بڑوں کی مناپلی اور بالادستی قائم کرے لہٰذا مسلمانوں کے لئے برائے حصول ریاست کے سوا ــــ نچلے طبقے کے لئے نہ تعلیم کا سوچ سکتی تھی نہ صحت کا نہ روزگار کا بلکہ نہ ہی طرز حکمرانی کا کیونکہ یہی مراعات انھیں پیدائشی طور پر حاصل تھیں اور وہ بہر قیمت انھیں نچلے طبقے پر لوٹا نہ سکتی تھی یہی وجہ ہے کہ ان میں نہ تو کوئی معاشی تھنکر پیدا ہوا اور نہ ہی کوئی سکالر۔

کیونکہ یہاں یہ سوچ سایہ فگن تھی کہ روزی کی تنگی اور کشایش اللہ کا مسئلہ ہے ہمارا نہیں — یہاں دوسروں کی بات نہیں خود قرآن کے نام لیواؤں نے بھی اس موضوع پر نہ سوچا نہ لکھا۔ حالانکہ غیر ملکی معاشی نظریات 1938م تک نہ صرف متعارف ہو چکے تھے اپنے اپنے حلقہ اثر میں نافذ اور جاری بھی تھے لیکن ہمارے قرآن کے نام لیواؤں کی رگ حمیت نہیں پھڑکی انھوں نے نہ تو قرآنی نظام معیشت کو متعارف کرایا اور نہ ہی منضبط۔ بلکہ "لمعات" نے 42 سالوں میں صرف مسلم لیگ کا دفاع کیا یا پھر نیشنلسٹ مسلمانوں کو ازروئے قرآن دائرہ اسلام سے خارج کر دینے کا بیڑہ اٹھایا یوں معلوم ہوتا تھا کہ قرآن مسلم لیگ کی حمایت میں اترا ہے یا یہ کہ مسلم لیگ کے مشورے سے نازل ہوا ہے۔ لیکن جوں ہی رواں صدی کے چھٹے اور ساتویں عشرے میں عالمی مزدور تنظیموں کی طرف سے روزگار' صحت' تعلیم' مکان' روزی اور بڑھاپے میں الاؤنس کی عالمی سطح پر بات ہوئی اور وہی بات پاکستانیوں کے کانوں تک بھی پہنچی تو خطرے کی گھنٹی بجنا شروع ہو گئی — سوشلزم کے افادی پہلو کو نظرانداز کرتے ہوئے اس میں ایسے ایسے خود ساختہ منفی مفاہیم شامل کر لئے گئے کہ متوسط طبقہ نے اسے ملحدانہ اشتراکیت سمجھ کر منہ تک نہیں لگایا۔مودودی صاحب کے امریکی درسگاہوں سے فارغ التحصیل علماء نے سوشلزم کو خدا کے انکار' اسلام کی نفی اور نظریہ پاکستان کے خلاف ٹھہرا کر لوگوں کی سوچ کو ہیجانی بنا دیا اسی طرح ان ہی کے اتباع میں "لمعات" والوں نے بھی یہ باور کرانا شروع کر دیا کہ سوشلزم سے قرآن کی نفی ہوتی ہے — مانا کہ تم سچ کہتے ہو لیکن کیا روٹی' تعلیم' صحت اور مکان وغیرہ جو کہ سوشلزم کے ظاہری مطالبے ہیں قرآن کی پالیسی سے متصادم ہیں کیا قرآن ان کی نفی کرتا ہے؟ کاش اس طرح کی سوچ نمود پذیر نہ ہوتی پھر اگر "ربوبیت" کوئی متبادل نظریہ تھا تو کیوں نہ عالمی ذرائع ابلاغ کے سہارے متعارف کرایا گیا؟ تاکہ بحث و تمحیص کے ذریعہ اسکے محاسن کا پتہ چلایا جا سکتا اور "معاشیین جدید" اس پر غور کرتے اور پھر کسی نظام کی حیثیت سے رد و قبول کا فیصلہ سنا سکتے اور پھر "لمعات" والے پورے اعتماد سے دونوں رائج معاشی نظاموں کو

للکارنے کی پوزیشن میں آ کر کہتے ــــ کہ ــــ آؤ ہمارے پاس "متبادل" موجود ہے!! ــــ لیکن ایسا نہیں ہوا اور آج تک لوگوں کو یہ پتا بھی نہ چل سکا کہ "ربوبیت" کی ٹیکنیکل تعریف کیا ہے؟ تو کیا ایسے میں بہتر نہ تھا کہ مسلمان صاحبان لوح و قلم کے افکار کے تناظر میں جن کی نظر کی گہرائی اور گیرائی نے بہت سے آفاق طے کر لئے تھے کوئی راہ متعین کی جاتی۔ اور کسی لبرل نظریہ معاشیات کی داغ بیل ڈال دی جاتی ــــ جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ مغربی سوشلزم کے مقابل (1894م) میں سب سے پہلے جمال الدین افغانی (1895م) نے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح وضع کی تھی اور ان ہی دنوں سرسید علیہ الرحمۃ (1898م) ابھی موجود تھے کہ شبلی نعمانی (1914م) نے "الفاروق" میں سوشلزم کو فاروق اعظم کے نظام عدل و نظام معیشت کی مانند قرار دے کر اپنی رائے کو ابہام میں نہیں رکھا ــــ ایسے میں اگر ان بزرگوں کو معلوم ہو جاتا کہ سوشلزم ملحدانہ اشتراکیت کا نام ہے تو وہ اسکا نام لینے سے بھی گریز کرتے۔ نہ صرف ان دو حضرات نے اس اصطلاح کو اپنانے میں عقیدے کا فساد محسوس نہیں کیا ــــ ان کے بعد میں آنے والوں نے بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کی امام الہند ابو الکلام (1958م) نے ترجمان القرآن میں لکھا ہے کہ اسے آزمانے کا موقع ملنا چاہیئے' حسرت موہانی اسے عالمی اور اسلامی معاشیات کے لئے سنگ میل قرار دیتے تھے' عبید اللہ سندھی (1945م)' سرحد کے عبدالرحیم پوپلزئی اسی نظام سے استفادے کی وصیت کرتے اور اسلام کی پالیسی قرار دیتے تھے' شام کے المرشد العام ــــ امام مصطفٰی السباعی مرحوم نے "الاشتراکیۃ الاسلامیۃ" لکھ کر اس اصطلاح کو اسلامی اصطلاح ٹھہرایا۔ مصر کے عبدالقادر عودہ مرحوم جو قانون اسلامی کے ماہر شمار ہوتے تھے اور محمد الغزالی نے الاوضاع الاشتراکیۃ میں اس اصطلاح سے بھرپور استفادے کی راہ ہموار کی ــــ اسی طرح بہت سے دیگر مسلمان مفکرین جو یہاں کی جماعت اسلامی کے پیشرو بھی تھے سوشلزم کو بمقابل راسمالیت ــــ نعمت غیر مترقبہ ٹھہراتے تھے ــــ لیکن تعجب ہے کہ جماعت اسلامی نے یہاں کی ایک جماعت کے خلاف جب برہنہ زبان استعمال کی تو اسے خیال نہ آیا

کہ ان کے اس وطیرے کی زد کہاں کہاں پہنچے گی؟ کرنل قذافی نے ان ہی علماء کی راہنمائی سے استفادہ کرتے ہوئے حدود لیبیا میں شہری حقوق—مکان، تعلیم—روزی اور تقسیم اراضی کو اس انداز سے نافذ کیا کہ ملوکیت کے اثرات بھی محو ہوتے گئے اور غربت و ادبار کے سائے بھی چھٹتے گئے بلکہ اس لیبین گورنمنٹ نے اپنا موٹو بھی "الاشتراکیۃ القرآن" ہی سے متعارف کرایا۔ کہنا چاہوں گا کہ قرآن محکم کے احکام کئی طرح کے ہیں بعض وہ ہیں جو بنیادی حیثیت رکھتے اور ناقابل تبدیلی ہوتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو قرآن کے عموم، خصوص، حقیقت، مجاز، اشارات و کنایات، مزاج، تقاضوں، عادات اور معروضی حالات کی ضو میں ترتیب پاتے ہیں۔ اور کچھ "موقت" بھی ہوتے ہیں جو متروک ہو کر پھر سابقہ ماحول میسر آنے پر زندہ بھی ہو جاتے ہیں ایسے میں ہربات کو قرآن کے لفظوں میں تلاش کرنا یا ہربات میں قرآن کے در پر دستک دینا فقہی شعور سے محرومی کی دلیل ہے۔

قرآنی پالیسی کے خدوخال

دنیا کا کوئی بھی نظام اگر عوام کو انصاف فراہم کرتا ہے، روٹی میسر آتی ہے، سر چھپانے کے لئے مکان کا اہتمام بھی ہو سکتا ہے—تعلیم، صحت اور تمام شہری حقوق مساوی سطح پر تقسیم ہوتے ہیں تو قرآن ایسے نظام کی نفی نہیں کرتا بلکہ اپنی پالیسی کا ضروری حصہ اور (مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا البقرہ، 269) کے مطابق فراست و فرزانگی کا الٰہی عطیہ ٹھیراتا ہے لہٰذا لادینی اور سیکولرازم کے نام پر ایسے نظام کے خلاف دیوار بن جانا بڑی ناانصافی ہو گی۔ ایک سوشلسٹ کہتا ہے کہ ماں، بہن، بیٹی، بھانجی اور بھتیجی سے نکاح حرام ہے اور خدا کا حوالہ نہیں دیتا تو اسے جھٹلانے کی کیا وجہ ہے؟ ایک سیکولرسٹ کہتا ہے کہ انصاف کسی گروہی اساس پر تقسیم نہ ہونا چاہیے تو اس میں کیا غلط بیانی ہے جسے مسترد کر دیا جائے؟ قرآن بھی تو یہی کہتا ہے—لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَ لَّا تَعْدِلُوْا—کسی قوم سے

مخاصمت کا جذبہ تمہیں اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم اسے انصاف ہی نہ دو۔ نہیں انصاف دینا ہی ہر بچاؤ کی گارنٹی ہے (مائدہ 8)

نیکی—— کسی قوم کی میراث نہیں ہے قوموں کے عادات و اطوار' افکار و نظریات' رسوم و خصائل ایک دوسرے کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں—— زمانہ جاہلیت میں "ودیک" نامی ایک چور نے بیت اللہ پر نذر چڑھائے سونے کی اشیاء چوری کیں لوگوں نے پکڑ کر اس کا دایاں ہاتھ کاٹ ڈالا بعد میں زمانہ اسلام میں اسی رسم کو "نظیر" بنا کر قانونی حیثیت دے دی گئی۔ حمورابی کے قانون کو نظیر بنا کر تورات کے کئی احکام مرتب ہوئے—— اسی طرح افکار کی نقل مکانی سے عادات اور پنچائتی فیصلے بھی منتقل ہوتے رہے—— قرآن ایسے فیصلوں کی نفی کرنے کی بجائے اگر انصاف پر مبنی ہوں تو "جذب" کرنے کی ترغیب دیتا ہے—— عبدالتعال صعیدی مصر کے ایک بڑے سکالر بھی ہیں اور لبرل بھی اور ساتھ ہی قرآنی فکر کے شیدا بھی۔ وہ لکھتے ہیں—— مدینہ ایک چھوٹی سی بستی تھی جس میں اشیائے صرف کی فراوانی نہ تھی—— ایک بار حضرت جابر بن عبد اللہ (697م) ایک قصاب کی دکان پر پہنچے اور گوشت خریدنے کے لئے کھڑے ہو گئے اس وقت فاروق اعظمؓ راؤنڈ پر تھے جابر کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے جابر نے تقریباً سارا گوشت وزن کرنے کو کہا تو فاروق اعظم سامنے آ گئے اور فرمانے لگے کہ—— جابر گوشت تو سارا تم لے جاؤ اور تمہارے بعد آنے والا محروم لوٹ جائے یہ کہاں کا انصاف ہے؟ چنانچہ آپ نے خود جابر ہی کو محروم کر دیا—— اور آئندہ کے لئے تنبیہہ کر دی کہ اتنا خریدو جو تمہارے دیگر بھائی بندوں کی گنجائش نکل سکے—— یہی قرآن کے مفکر صعیدی صاحب لکھتے ہیں کہ مسجد نبوی کے باہر شمالی میدان میں لوگ (بعد از نماز صبح) غلے اور خشک میوہ جات وغیرہ کی ڈھیریاں لگا کر بیٹھتے تھے ایک بار فاروق اعظم کا ادھر سے گزر ہوا آپ نے حاتم بن ابی بلتعہ(..) کی "منقیٰ" کی ڈھیری لگی ہوئی تھی اس پر رک کر نرخ دریافت کیا۔ دام بازار سے زیادہ تھا آپ نے "درہ" اونچا کیا (علا درّته) اور فرمایا حاتم بازار کے نرخ پر کاروبار کر دیا پھر دکان بڑھا لو—— ایک بار ایسی ہی مارکیٹ پر آپ پہنچے اور غلہ

کی ایک ڈھیری پر ہاتھ ڈال دیا غلہ باہر سے خشک اور اندر سے نم تھا آپ نے اسے بھی بازار سے نکل جانے کا حکم سنا دیا۔

اب اگر آپ **صعیدی** سے دریافت کریں گے کہ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ جابر، حاتم اور ایک دوسرے صاحب کے ساتھ فاروق اعظمؓ نے جو کچھ کیا درست تھا — تو ظاہر ہے **صعیدی** صاحب بایں علم و دانش لاجواب ہو کر صرف اتنا کہہ پائیں گے کہ قرآن کے الفاظ تو نہیں مگر پالیسی یہی ہے کہ "منکو" (برائی) پر کنٹرول کیا جائے — تو میرے بھائی قانون میں صرف الفاظ ہی پر انحصار نہیں کیا جاتا — قانون کے مزاج قرآن کی عمومی پالیسی — تقاضوں اور معروضی حالات کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ والسلام

زمینداری جاگیرداری اور اسلام

اس معرکہ آرا کتاب میں قرآن حکیم کی تعلیمات، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، صحابہ کرام کے طریقے اور عظیم مسلمان مفکروں کے حوالے سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام ایک انقلابی دین اور تحریک ہے، جس نے امیر اور غریب میں مساوات قائم کی اور بلال حبشیؓ کو عثمان غنیؓ کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا۔ اس میں زمین کی شخصی ملکیت از روئے قرآن۔۔ ملکیت کو اجتماعی بنانے کے اصول وضوابط۔۔ نقد لگان اور مستاجری کی نفی۔۔ بٹائی کی نفی۔۔ **جاگیرداری** کا شرعی سہارا۔ جیسے اہم اور آتشیں موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس انقلاب آفریں کتاب کا مطالعہ اسلام اور نظریہ پاکستان کی روح کو سمجھنے کے لئے بے حد ضروری ہے۔ کتاب کے مصنف پاکستان کے جید عالم رحمت اللہ طارق ہیں، جنہوں نے مدینہ منورہ میں برسوں قرآن وحدیث کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور وسعت مطالعہ اور تحقیق و تلاش میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ کتاب عرصہ دراز سے نایاب تھی، علم دوست خواتین وحضرات کے لئے نیا اضافہ شدہ ایڈیشن عنقریب دستیاب ہوگا، خط لکھ کر اپنی کاپی آج ہی محفوظ کرائیں۔

ادارہ ادبیات اسلامیہ، 1339/3، گلشن آباد، بیرون پاک گیٹ، ملتان

سرسیدؒ میموریل لائبریری، کالج سٹاپ، جی ٹی روڈ، باغبانپورہ، لاہور

اشاریہ

انتساب۔ 5

پس منظر۔ 7

زکوٰۃ کا رائج نظام فرسودہ اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔ 11

زکوٰۃ۔ اسلام کا مالیاتی نظام۔ 14

زکوٰۃ ایک عبوری حکم ہے۔ 15

حکم زکوٰۃ کے مخاطب کون۔؟ 16

مالیات کا دوسرا اہم ذریعہ۔ 17

غنیمت اور فئے کے تناظر میں۔ 18

کتنی مالیت پر زکوٰۃ ہے؟ 19

اڑھائی فی صد کا ماخذ۔ 20

اجماع امت کی دہائی۔ 22

جھوٹ پر یقین کی عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی۔ 22

حدیث اور اثر میں فرق۔ 25

امام العصر محمد عبدہ کا فکر انگیز تجزیہ۔ 25

شیطانی حیلے۔ 27

نصاب کی بات۔ 29

درہموں کے وزن یکساں نہیں ہوتے تھے۔ 30

زکوٰۃ کی شرح معروضی حالات کے تابع ہے۔ 32

صلہ کا معیار محنت یا سرمایہ؟ 35

تکمیل دین کی نئی تشریح۔ 38

نظریاتی اساس سے انحراف۔ 39

قرآن کی لیبر پالیسی اور ملاں۔ 40

قرآن کی روشن آیات شبہات کی دلدل میں۔ 43

علامہ رشید رضا کا زاویہ نظر۔ 44

زر آور صرف محنت ہے۔ 45

لینن سے پہلے ابن حزم۔ 49

انصاف ہی تقویٰ کی اساس ہے۔ 52

قرآن سے بہتر کی تلاش۔ 54

عالمی رسول علاقائی پالیسی نہیں دے سکتا۔ 56

شریعت جب ہماری امنگوں پر پوری نہ اترے۔ 57

پالیسیاں مقصود بالذات نہیں ہوتیں۔ 59

لینن سے پہلے ابن حزم۔ 60

بنیادی ضرورتوں کا ذمہ دار کون؟ 61

تنہا سرمایہ دار ہی دولت کا مالک 62

نہیں بن سکتا۔	62
ذخیرہ اندوز انسانیت کا دشمن ہے۔	63
دولت کا پجاری زہریلا سانپ۔	64
ضرورت سے زیادہ مال کسی کی	64
ملکیت نہیں رہتا۔	64
فاضل دولت چھیننے کے فاروقی	65
عزائم۔	65
اس فرمان کا مآخذ۔	66
زکوٰۃ جب کافی نہ ہو۔	67
خشک سالی میں راشن سسٹم۔	68
ذخیرہ اندوزوں اور سرمایہ کے	69
سانپوں کا سر کچلنا کیسا۔	69
ذخیرہ اندوز کو مار ڈالنے پر قصاص	70
نہیں ہے۔	70
اسلام میں اجتماعیت کا تصور	**73**
صنعتی جاگیریں۔	78
تحریف کا سہارا۔	79
صلہ کا معیار پیسہ ہے یا عمل؟	80
زکوٰۃ دے کر بھی صنعتی جاگیردار	81
نہیں بچ سکتا۔	81
زمین انفرادی ملکیت بنانے	81
کی ممانعت۔	81
غیر منقولہ کو انفرادی ملکیت	82
سے نکالنے کا حکم۔	82
مودودی صاحب بپھر گئے۔	83
اجتماعیت کا مطالبہ زور پکڑتا جارہا تھا۔	84
معاوضہ دے کر انفرادی ملکیت کا خاتمہ۔	85
سرزمین فراعنہ اجتماعی قانون کی زد میں	87
قرون اولیٰ میں اجتماعیت کا موجودہ	87
تصور نمایاں تھا۔	87
واقعہ خیبر کا بہانہ۔	88
اجتماعیت کے لئے نجی تصرفات پر نگرانی۔	90
نوکر شاہی کا احتساب۔	92
حرف مکرر۔	93
نج کاری کا طاعون۔	96
انبیائے کرام سماجی ہمسری کا درس دیتے تھے لیکن زردار نہیں مانتے تھے۔	**99**
نوح کا درس مساوات۔	103
انقلاب شعیب کی مزاحمت۔	103
مسیح کے ماننے والوں کی توہین۔	104
پیغمبر انسانیت ہمسری کی راہ پر۔	105
طبقاتی سماج کے نقصانات۔	106
عنصری کلچر کا کینسر۔	107
اسلام بھی گوسالہ عنصریت کی	109

بھینٹ چڑھ گیا۔	109
انقلاب ہی ناہموار سماج کو	110
بدل سکتا ہے۔	110
پیغمبر انسانیت کا وطیرہ کیا تھا۔	112
جاگیرداری سماج کو پہلا رگڑا	**115**
حسبنا کتاب اللہ۔	117
عراق اسلامی عملداری میں۔	118
فاتح مصر عمروؓ بن العاص	119
اور مطالبہ تقسیم۔	119
ام کرز کا معاملہ۔	120
زائدز میں کی واپسی۔	122
قرآنی انصاف کی تلاش۔	**125**
حسبنا کتاب اللہ۔	127
عمر فاروقؓ۔	128
حصول انصاف کی تلاش۔	129
انصاف والے آگے نہیں آتے۔	130
اہل انصاف کی قدر افزائی۔	130
انصاف قرآن کے بغیر ناممکن ہے۔	131
معرکہ انصاف وستم رانی۔	132
انصاف اپنے گھر سے۔	133
انصاف پر خوفناک حملہ۔	133
جرم بذمہ خدا؟	134
انصاف کی مکرر دستک۔	135
انصاف درہ خیبر تک۔	136
قرآن کا معاشی نظام بحال کرو	**139**
کیا روٹی طبقاتی معیار کے	142
مطابق ہی ملنی چاہئے؟	142
بے مصرف ملکیت نذر آتش۔	143
غربت کا بنیادی سبب سرمایہ	145
داروں کا وجود ہے۔	145
ذخیرہ اندوز کی موت	146
ناقابل قصاص ہے۔	146
امیر کھائیں اور غریب	147
بھوکوں مریں۔	147
چھوٹے اور بڑے کا معاشی	148
امتیاز نہ رہنے دوں گا۔	148
ایک سے زیادہ مکانات	148
رکھنے کا مسئلہ۔	148
قرآن کی جنرل پالیسی۔	150
قرآنی پالیسی کے خدوخال۔	153

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاَتِمُّوا الحَجَّ وَالعُمرَةَ لِلّٰہِ فَاِن اُحصِرتُم فَمَا استَیسَرَ مِنَ الھَدیِ
وَلَا تَحلِقُوا رُؤُسَکُم حَتّٰی یَبلُغَ الھَدیُ مَحِلَّہٗ (بقرہ، 196)

قربانی کی شرعی حیثیت

رحمت اللہ طارق

(نیا اضافہ شدہ ایڈیشن دستیاب ہے)

☆

سر سیدؒ میموریل لائبریری، کالج شاپ باغبانپورہ، لاہور